خطبات صدارت

پنجاہ سالہ جوبلی

خطباتِ صدارت

پنجاہ سالہ جوبلی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

منعقدہ ماہ مارچ ۱۹۳۷ء بمقام علی گڑھ

یعنی

اُن بارہ ۱۲ خطبوں کا مجموعہ جو کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر اُس کے مختلف شعبوں میں پڑھے گئے

اور

حسب ارشاد نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی
آنریری سکرٹری کانفرنس

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ میں چھپے ۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

خزینۂ معلومات مفت طلب کیجئے

چند سال سے کانفرنس نے اپنا بک ڈپو قائم کیا ہے، جس میں اُردو کے تمام مشہور مصنفین مثلاً نواب محسن الملک، مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حافظ نذیر احمد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) وغیرہ کی تصنیفات موجود ہیں جو مناسب نرخ پر فروخت ہوتی ہیں۔

بچوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت و نیز فن تعلیم کے متعلق بھی متعدد مفید کتابیں اس بک ڈپو سے مل سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ چند سال میں خود کانفرنس نے جو عمدہ و دلچسپ کتابیں نہایت اہتمام سے حسن طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی ہیں مثلاً ذکر مبارک، ذکر جمیل، ذکر حبیب، وقار حیات، حیات محسن، یاد ایام، خطبات عالیہ، مرقع کانفرنس، التربیۃ الاستقلالیہ، سلاطین معبر، تاریخ ملیبار، رسالہ اتالیق، بچوں کی تعلیمی ریڈریں، گنجینۂ اسکاوٹنگ، صولت شیر شاہی، ہمایوں نامہ، حیات رضا وغیرہ خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں، ایک خاص بات یہ ہے کہ عام فائدہ کے خیال سے باوجود ظاہری و معنوی محاسن کے ان کی قیمتیں بہت کم رکھی گئی ہیں۔ یہ کتابیں بھی کانفرنس بک ڈپو سے ملتی ہیں، اور زیادہ خریداری پر تاجروں کو کمیشن بھی دیا جاتا ہے۔

ان کتابوں کے تفصیلی حالات اور ان کی قیمتیں رسالہ "خزینۂ معلومات" سے معلوم ہونگی۔ آپ صرف ایک کارڈ لکھ دیجئے۔ رسالہ خزینۂ معلومات جو ۱۵۲ صفحہ کا ہے دفتر سے محصول ڈاک لگا کر آپ کی خدمت میں بلاقیمت بھیجدیا جائے گا۔ اُس کو پڑھکر آپ اپنے مذاق و شوق کی کتابیں طلب کر لیجئے۔

ملنے کا پتہ: صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

٧٨٦

فہرستِ مضامین

خطبات پنجاہ سالہ جوبلی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

خطبۂ صدارت

پروفیسر مولوی حاجی الیاس برنی صاحب

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا، متعدد شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، ہر شعبہ کے صدر اور سکرٹری علیحدہ علیحدہ تھے۔

منجملہ ان شعبوں کے ایک "شعبہ معاشیات و اصلاح معاشرت" تھا، جس کے صدر پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے ایل ایل بی، ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ حیدرآباد دکن تھے، اور سکرٹری شیخ عطاء اللہ صاحب مسلم یونیورسٹی تھے۔

اس شعبہ کا اجلاس ۸ بجے شب کو اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا، جس میں پروفیسر برنی صاحب نے بحیثیت صدر حسب ذیل خطبہ پڑھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ صدارت شعبۂ معاشیات و اصلاح معاشرت

از

پروفیسر مولوی حاجی الیاس برنی صاحب

حضرات! الحمد للہ کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اپنی پنجاہ سالہ جوبلی منا رہی ہے۔ اس تقریب کی خوشی میں جو جلسے منعقد ہو رہے ہیں وہ چند شعبوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں سے ایک شعبہ "**معاشیات اور اصلاح معاشرت**" ہے اور اس شعبہ میں صدارت کی عزت مجھکو بخشی گئی۔ اوّل تو اس عہدہ کے واسطے مجھ سے بہتر انتخاب ممکن تھا۔ دوسرے میں شروع سے عزلت گزیں سا رہا ہوں۔ تصنیف و تالیف یا ترجمہ کا کام جو کچھ بن پڑا اور جیسا کچھ بن پڑا کر لیا یا کبھی محمڈن کالج علی گڑھ میں اور اب جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں جو علمی اور انتظامی کام تفویض ہوئے انجام دیئے۔ لیکن جس کو انگریزی میں "پبلک لائف" کہتے ہیں اور جس کے دو محل پریس اور پلیٹ فارم مانے جاتے ہیں، میں ان سے ہمیشہ کنارہ کش رہا۔ اس لئے نہیں کہ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا اور اس کی قدر نہیں کرتا۔ بلکہ اس لئے کہ مجھکو اپنی حد تک یکسوئی میں کام کرنے کی زیادہ ضرورت

نظر آئی اور جس کو جہاں کام کی ضرورت نظر آئے وہیں کام کرنا مقدم ہے۔ چنانچہ اپنے معمول کے مطابق دل چاہا کہ اس جلسہ کی صدارت سے عذر کر دوں۔ لیکن اندیشہ ہوا کہ میرے عذر سے خواہ وہ کیسا ہی قرینِ اصول کیوں نہ ہو کہیں خدانخواستہ بے اعتنائی اور بے تعلقی کا شبہ پیدا نہ ہو جائے اور کوئی علیگ مسلم یونیورسٹی یا اس کے کسی ادارے سے بے اعتنائی اور بے تعلقی برتے، اس سے بڑھکر قابلِ شکایت اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ لہذا میں تعمیلِ فرمائش کے واسطے آمادہ ہو گیا۔ ایسے تاریخی موقع پر مجھکو جو صدارت عطا ہوئی۔ یہ بڑی قدر افزائی ہے۔ میں تہِ دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو ملک و ملت کی خدمت کے وسیع موقعے عطا فرمائے آمین

سب کو معلوم ہے کہ سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی اور دس سال بعد ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ چنانچہ وہی ایم اے او کالج ترقی کر کے ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی بن گیا اور ۱۹۲۵ء میں بڑی دھوم دھام سے اس کا پنجاہ سالہ جشن منایا گیا۔ اسی طرح ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پنجاہ سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی تقریب نہیں ہے کہ ملنے اور دل خوش کرنے کے لئے احباب جمع ہو گئے ہوں۔ بلکہ ایک قابل یادگار تقریب ہے کہ اکابرِ قوم یکجا بیٹھکر سوچیں اور سمجھیں کہ کن حالات کے تحت، کس ماحول میں آج سے ۵۰ سال قبل ترقیٔ تعلیم کے خیالات پیدا ہوئے، کیا کیا اہتمام ہوئے، کیا دور گزرے، کس حد تک کام انجام پائے اور آئندہ کس طریق پر کیا کام انجام دینے مقصود ہیں۔

انیسویں صدی میں بالخصوص ۱۸۵۷ء کے بعد جب کہ سلطنتِ مغلیہ کا ٹمٹماتا چراغ گُل ہوا ملک پر جو اندھیر چھایا اور مسلمانوں پر مصائب کا جو سیلاب آیا۔ اس کی روداد آج بھی کوئی سُنے تو دل خون ہوتا ہے۔ یہی وہ معرکہ تھا جس میں اچھے اچھے دل چھوٹ گئے۔ قومی بندھن ٹوٹ گئے۔ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ قومی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اُس زمانہ کی شاعری دیکھئے اور شاعری قومی جذبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ تو اس کا نمایاں شعبہ مایوسی سے رنگا ہوا ہے۔ بلکہ ماتم سے بھرا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ خواجہ حالی

مرحوم جیسے بیدار اور حوصلہ مند شاعر بھی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ انتہائی درد سے فرماتے ہیں ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

پس وہ کیا ہی سبھ گھڑی ہوگی جبکہ سرسید علیہ الرحمۃ کا دل بیدار رہوا۔ وہ کیا ہی سچا دل تھا جس میں قوم کی تنظیم و تعلیم کا عزم پیدا ہوا اور وہ کیا ہی پکا عزم تھا جس نے مایوسی میں مراد کا پیام سنایا، خزاں میں بہار کا نقشہ جمایا، تباہی کے طوفان میں ترقی کا بیڑا اُٹھایا اور کس ہمت سے اس کو پار لگایا ؎

آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ؎

سرسید علیہ الرحمۃ کا یہ کارنامہ ہمیشہ ہمیشہ تاریخ ہند اور تاریخ اسلام میں یادگار رہے گا۔ ظاہری آثار تو آنکھوں کے سامنے موجود ہیں لیکن اس کارنامہ کی باطنی قوت کیا تھی۔ ملک و ملت کی محبت، قومی غیرت، دینی حمیت اور اس کے لوازم ذاتی ایثار، ذاتی انہماک اور ذاتی استقامت۔ اور یہ سب کرشمے ہیں حضرت عشق کے جن کے مظاہر سے کائنات بنی ہے۔ اَدنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک مظاہر کی کوئی انتہا نہیں یہی عشق انسان کو حیوانیت میں پھنساتا ہے۔ تو یہی عشق نہ معلوم اس کو کہاں سے کہاں تک پہنچاتا ہے۔ غور سے دیکھیئے تو کائنات پر چھایا نظر آتا ہے۔ چنانچہ حضرت میر تقی میرؔ مرحوم فرماتے ہیں اور خوب فرماتے ہیں ؎

اوّل آخر ظاہر باطن چاروں اور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جناب عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق

یہی عشق یہی محبت، یہی لگن، یہی دھن جب اعلیٰ رخ پر آتی ہے تو نفسانیت کی کثافت مٹا کر انسانیت کے جوہر دکھاتی ہے۔ چنانچہ انسانیات کے ماہر حضرت مولانا روم

علیہ الرحمۃ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
وے طبیب جملہ علت ہائے ما

اور جب انسانیت کے جوہر کھلے تو اہل عشق کا دعویٰ ہے اور دنیا شاہد ہے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

چنانچہ یہی عشق افراد سے گزر کر جماعت کی طرف رخ کرتا ہے تو قومی ترقی کی روح رواں بن جاتا ہے۔ اگر یہ ہو اور کچھ نہ ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور اگر سب کچھ ہو اور یہ نہ ہو پھر کچھ بھی نہیں۔ روح آتی ہے تو جسم ساتھ لاتی ہے اور اس کی نشو و نما کرتی ہے۔ جاتی ہے تو جسم چھوڑ جاتی ہے اور بے جان جسم کا انجام معلوم۔ چنانچہ جب بھی بڑے سے بڑے ادارے کی روح نکل جائے تو خود غرضی، بے وفائی اور نفاق کے جراثیم اس کے جسم میں اپنا کام شروع کر دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ تاریخ عالم اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ بقا و فنا کے سلسلہ میں یہی قانون کارفرما نظر آتا ہے۔

پھر بقا میں بھی دو حالتیں ممکن ہیں۔ صحت اور علالت اور پھر علالت کی بھی دو شکلیں ہیں۔ عضوی اور فعلی جن کو انگریزی میں آرگینک اور فنکشنل کہتے ہیں۔ عضوی مرض زیادہ سخت مانے جاتے ہیں کہ وہ کسی عضو کے نقص سے پیدا ہوتے ہیں اور خود عضو کی اصلاح دشوار ہوتی ہے۔ ان کے مقابل فعلی امراض کا علاج نسبتاً کم دشوار ہوتا ہے۔ خود عضو میں تو کوئی نقص نہیں ہوتا۔ صرف اس کا فعل خراب ہو جاتا ہے اور فعل کی اصلاح چنداں دشوار نہیں۔ یہی کیفیت اداروں کی بھی سمجھنی چاہیئے۔ کبھی تو خود کارکن جماعتیں ناقص اور ناکارہ ہوتی ہیں اور کبھی طریق کار میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہر صورت اصلاح و ترمیم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ قدرتی اشخاص کے اجسام میں تو کسی عضو کا رد و بدل دشوار بلکہ تقریباً محال ہے۔ مثلاً کسی جسم میں ناقص آنکھ بدلنا یا ناقص دل بدلنا۔ لیکن قانونی شخصیتوں کو لیجئے اور سب باضابطہ ادارے قانونی شخصے

مانے جاتے ہیں۔ تو ان کے اجسام میں اعضا کا ردو بدل فی الجملہ آسان ہی۔ بلکہ ضروری اور مفید سمجھا جاتا ہی۔ آئینی حکومتوں کو لیجئے۔ بڑے بڑے جدید اداروں کو لیجئے اور جامعات بھی ایسے ہی اداروں میں داخل ہیں۔ کارکن جماعتوں کا جو وقتاً فوقتاً انتخاب ہوتا ہی، تقرر ہوتا ہی۔ تو اس کا یہی مقصد ہی کہ اعضا ناقص اور ضعیف ہوں تو خارج ہو جائیں۔ صحیح اور قوی ہوں تو برقرار رہیں۔ تنسیخ و تجدید ہوتی رہے۔ رہا طریق کار سو اس کی اصلاح و ترمیم تو کوئی بات ہی نہیں۔ قوانین و ضوابط میں یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہی۔ لہٰذا کسی ادارے کی صحت برقرار رکھنے کے لئے لازم ہے کہ کارکن جماعتیں اور طریق کار اپنی اپنی جگہ صحیح اور درست رہیں اور ضرورت محسوس ہو تو ان کی اصلاح و ترمیم ہوتی رہے۔

صحت و علالت کی جو داخلی شکلیں بیان ہوئیں ان کے سوا کچھ خارجی اسباب بھی توجہ کے طالب ہیں۔ خاص کر معاش اور آب و ہوا۔ افلاس و تنگ دستی سے بہت کچھ امراض پیدا ہوتے ہیں۔ معاش بقدر ضرورت میسّر ہو اور اس سے بطریق مناسب کام لیا جائے تو صحت و قوت قائم رہتی ہے۔ بلکہ ترقی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ آب و ہوا بھی اچھی ہونی ضرور ہے۔ خرابی آب و ہوا کی وجہ سے اچھے تندرست آدمی بیمار پڑ جاتے ہیں اور خوبی آب و ہوا سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں۔ علیٰ ہذا اوّل تو جامعہ ہو یا کانفرنس ایسے اداروں کی مالی حالت قابل اطمینان ہونی چاہیئے۔ آمدنی بھی کافی ہو اور اس کے مصارف بھی معقول ہوں۔ نہ افلاس ہو نہ اسراف۔ اس کے سوا ایسے اداروں میں اخلاق و عادات، خیالات و جذبات، منقولات و روایات، مشاغل و معمولات اس نوعیت کے جمع ہوں اور نشو و نما پائیں کہ سب مل کر اپنے ادارے کی غرض و غایت کی تائید و تقویت کریں۔ آب و ہوا بڑی چیز ہے۔ اگر موافق اور مناسب ہو تو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی ہے۔ ناموافق ہو تو بہت کچھ کوشش اور محنت اکارت جاتی ہی۔ نباتات، حیوانات، انسان اور اس کے ادارے سب اسی قانون کے یکساں تابع ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ انسانی اداروں کی حالت بھی زندہ اجسام کی سی ہے۔ یہ پیدا

ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔ یہ تندرست رہتے ہیں اور بیمار پڑتے ہیں۔ ان کی بیماری کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ عضوی یا فعلی یا دونوں کا اجتماع۔ یہ معاش کے محتاج ہوتے ہیں، آب وہوا کا اثر لیتے ہیں۔ حالات موافق ہوں تو خوب بڑھتے ہیں، پھولتے پھلتے ہیں، ناموافق ہوں تو مرجھاتے ہیں، مرجاتے ہیں۔

صحّت وعلالت تو زندگی کے ساتھ ہے۔ لیکن بہرصورت ایک عمر ہوتی ہے، عمر طبعی کا ایک اندازہ رہتا ہے۔ مثلاً انسان کی عمر طبعی ساٹھ سال مانی جاتی ہے لیکن عمر کا تعین نہیں کم بھی ہوتی ہے اور زیادہ بھی۔ انسان کی طرح انسانی اداروں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ مثلاً سلطنتوں کی عمر، حکومتوں کی عمر، کارخانہ جات کی عمر۔ علیٰ ہٰذا جامعات کی عمر۔ ان میں نوعمر بھی ہوتے ہیں، جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ کم عمری میں بھی ضائع ہوجاتے ہیں اور بڑی بڑی عمریں بھی پاتے ہیں۔ جامعات ہی کو لیجئے تو قدیم زمانہ میں ان کے بڑے بڑے کارنامے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں ٹکسیلا اور نلندا کے حالات جوں جوں دریافت ہو رہے ہیں لوگ حیران ہو رہے ہیں۔ بغداد و قرطبہ کی جامعات کے کارنامے تو ہر طرح معلوم ومسلم ہیں۔ آج بھی یورپ میں جامعات کو دیکھئے توصدیوں سے قائم ہیں اور ان کے فیضان سے ملک مالا مال ہو رہے ہیں۔ سلطنتیں ان کی دست نگر ہیں۔ حکومت ہے تو ان کا فیضان ہے، سیاست ہے تو ان کا فیضان ہے، صنعت وحرفت اور تجارت ہے تو ان کا فیضان ہے، تہذیب و تمدن ہے تو ان کا فیضان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں اپنی جامعات کی اتنی قدر اور حفاظت کرتی ہیں جتنی کہ کوئی طبیب دل ودماغ کی کرتا ہے۔ آج برطانیۂ عظمیٰ کو کیمبرج اور آکسفورڈ پر جو ناز ہے وہ ہاؤس آف کامنس اور ہاؤس آف لارڈس سے کم نہیں ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہے کہ جو دل ودماغ یہاں کام کرتے ہیں وہ اکثر وہیں تعلیم وتربیت پاتے ہیں۔

اغراض ومقاصد کے اعتبار سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلم یونیورسٹی کی دمساز ہے۔ جو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر تعلیم وتربیت کا پیام سُناتی ہے۔ ملک وملت میں بیداری

پھیلاتی ہے۔ بعض لوگوں کا شاید خیال ہو کہ اب اس دمسازی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کانفرنس کو جو پیام پہنچانا تھا پہنچا چکی۔ جو بیداری پھیلانی تھی پھیلا چکی۔ گویا اب یہ عمرِ طبعی کو پہنچ چکی۔ بڑھاپے میں گھر بیٹھے پرانے قصے سناتی رہے، دل بہلاتی رہے۔ حسنِ خاتمہ کی دعا کرے۔

اگر تعلیم کی انتہا ہو چکی، اگر بیداری کی انتہا ہو چکی، اگر ترقی کی انتہا ہو چکی اور اگر واقعی ان کاموں کی انتہا ہو سکتی ہے تو ممکن ہے کہ کانفرنس کا کام بھی ختم ہو گیا ہو یا ختم ہو سکے لیکن اگر ابتدا کو انتہا سمجھ لیں، اگر پہلے قدم کو منزل بنالیں تو انجام معلوم۔ اگر قوم کو کام کرنا ہے اور دوسری قوموں کی طرح اعلیٰ پیمانہ پر کرنا ہے تو یونیورسٹی کے علاوہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی ضرورت ہے اور ضرورت رہے گی۔ البتہ شرط یہ ہے کہ کانفرنس بھی ترقیاتِ زمانہ کا ساتھ دے اور اپنے دائرۂ عمل میں مطالبات ترقی کی سبیل و تکمیل کرے۔ یہ کافی نہیں کہ شاندار سا دفتر بنالیا۔ مستقل امدادیں منظور کرالیں چندے کے واسطے ادھر اُدھر سفیر بھیج دیئے۔ دھوم دھام سے سالانہ جلسے کر لئے۔ دل خوش کن رزولیوشن پاس کر لئے۔ رپورٹ شائع کر دی اور فراغت سے بسر ہوتی رہی۔ اگر کانفرنس قوم کی توجہ اور تائید حاصل کرنا چاہے اور اس کو برقرار رکھنا چاہے تو لازم ہے کہ عملی پروگرام بنائے اور کارگزاری دکھائے اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ اس پنجاہ سالہ جشن میں کانفرنس نے جو ۱۲ شعبے قرار دیئے ہیں۔ ان سے اس کے پروگرام کی وسعت و جامعیت ظاہر ہوتی ہے اور اگر وہ اس پروگرام کے خاکہ پر تعمیری کام شروع کر دے تو اس کے سامنے ترقی کا بہت وسیع میدان موجود ہے۔ دل کھول کر ملک و ملت کی خدمت کر سکتی ہے اور حسبِ دل خواہ اس کو قوم سے امداد مل سکتی ہے ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر کرد

اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

حضرات! ممکن ہے بعض دلوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ میں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اور اس کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کا جو ذکر کیا تو اس میں زیادہ تفصیل سے

کام لیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اوّل تو مجھے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی میں قدیم تعلق کے سوا جدید تعاون کا بہت موقع نظر آتا ہے۔ دوسرے یہ کوئی معمولی سالانہ جلسہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک تاریخی پنجاہ سالہ جلسہ ہے۔ لہذا ضرور تھا کہ اس منزل پر پہنچ کر ان اداروں کے ماضی حال اور مستقبل پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔ اسی اصول کے مدنظر میں نے مختصر کیفیت عرض کرنا اپنا فرض سمجھا۔ ورنہ یہ سہل تھا کہ شعبہ کے مبحث سے ابتدا کرکے اسی پر اکتفا کیا جاتا۔ بہرحال میں ان اداروں کے تاریخی اور تعمیری پہلوؤں کو نظرانداز نہ کرسکا اور نہ کرسکتا تھا۔ لہذا اگر یہ کیفیت طویل سمجھی جائے تو معذرت چاہتا ہوں۔

اب شعبہ کے مبحث کو لیجئے۔ اس میں بھی دو طریق ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ معاشیات اور معاشرت کے علمی اعتبارات و تعلقات اول عام فہم کردیئے جائیں۔ تاکہ زیربحث مسائل بہتر سمجھ میں آئیں۔ دوسرے یہ کہ صرف متعلقہ مسائل بحث میں لائے جائیں۔ علمی اعتبارات و تعلقات نظرانداز کردیئے جائیں۔ لیکن ایسے موقعہ کے واسطے طریق اول زیادہ مناسب اور مفید معلوم ہوتا ہے کہ دلچسپی بڑھے اور علمی نظر پیدا ہو۔

تمدن معاش اور معاشرت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ان ہی جھمیلوں میں پڑکر انسان انسان بنتا ہے۔ بے تعلقی و گوشہ نشینی، ریاضت و عبادت یہ بھی بڑے کام ہیں۔ روحانی ترقی کے مقام ہیں لیکن ان سے ملکوتی صفات ابھرتے ہیں۔ انسانی کمالات نمودار نہیں ہوتے۔ اس لئے کہنے والے نے خوب کہا ہے ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

رہبانیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیوی حقوق و فرائض سے دل گھبرانے لگتا ہے اور پرسکون عبادت کی محویت چاہتا ہے۔ حالانکہ انسان کی دنیوی زندگی حقوق و فرائض سے لبریز ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

علاوہ بریں رہبانیت میں بھی نفس چاہے تو اپنی راحت و تقویت کے سامان پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ بہت سوں نے اس کو ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق بنا لیا۔ گرچہ عبادت کا لزوم اور فیضان مسلّم ہے۔ تاہم بعض نے رہبانیت کے خوف سے انسانیت کے پہلو کو اس درجہ مقدم رکھا کہ گویا عبادت کو بھی اس میں ضم کر دیا ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

بہرحال انسان مدنی الطبع مخلوق ہے۔ مل جل کر رہنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ میل جول سے لازماً حقوق و فرائض کے بے شمار تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ تعلقات بطریق احسن سنبھالے جائیں تو ترقی ہی ترقی ہے۔ اہلِ دنیا کی نظر میں دنیا تک، اہلِ دین کی نظر میں عقبیٰ تک اور اگر ان تعلقات میں فتور پڑ جائے تو پھر تباہی کی بھی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی۔ خاندان سے لے کر قوم تک اور قوم سے لے کر اقوام تک اور پھر خدا جانے کہاں تک۔

انسان کو بحیثیت فرد دیکھیے۔ تو مخلوقات میں بہت کمزور اور پھسڈّی نظر آتا ہے۔ تنِ تنہا نہتّا ہو تو معمولی افعال میں ادنیٰ ادنیٰ جانوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نہ دوڑ بھاگ میں، نہ کود پھاند میں، نہ اُڑان میں، نہ تیراکی میں، نہ حملہ میں، نہ مدافعت میں، نہ قوّت میں، نہ طاقت میں۔ لیکن جب یہ مل جل کر کام کرتا ہے اور اس کے ساتھ دل و دماغ سے کام لیتا ہے تو پھر کون ہے جو اس کا مقابلہ کرے۔ دنیا میں تو کوئی مقابل نظر نہیں آتا، سب مطیع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ تمام مخلوق میں کوئی اس کا مدمقابل نہیں اور خالق کے سوا کوئی نہیں جس کے سامنے یہ سر جھکائے اور لطف یہ کہ پھر بھی عاجز کا عاجز بندہ کا بندہ۔ کوئی مانے نہ مانے حقیقت تو یہی نظر آتی ہے ؎

ما ہیچ نئیم جملہ مائیم
گہ نگنجیم و گہ ہمائیم

خلاصہ یہ کہ انسان کی ترقی اجتماع اور تعاون میں مضمر ہے۔ تن تنہا انسان

کیا کر سکتا ہے اور میل ملاپ کے زور سے انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی خاصیت ریاضی کے ہندسوں کی سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہندسہ تن تنہا زیادہ سے زیادہ نو کا عدد بن سکتا ہے۔ لیکن اگر صرف ایک کے ہندسہ میں دو صفر لگا دو تو سو کا عدد بن جاتا ہے اور اگر کہیں نو کے تین ہندسے یکجا ہو جائیں تو پھر نو سو ننانوے (۹۹۹) لیجئے۔ غرض کہ تن تنہا انفرادی طور پر انسان ادنیٰ وحشیانہ زندگی کی ضروریات بھی بمشکل حاصل کر سکتا ہے لیکن اجتماع اور تعاون کی برکت سے اعلیٰ تمدن کے کیسے کیسے ساز و سامان مہیا کر رہا ہے کہ عقل حیران ہے۔ چنانچہ دور جدید کے دو ہی بڑے امتیازات ہیں۔ ایک تو وسیع پیمانہ پر انسان کا اجتماع اور تعاون۔ دوسرے تمدن کی ترقی اور لوازم تمدن کی فراوانی و ارزانی۔ گرچہ روحانی اور اخلاقی تربیت کی کمی سے اس مادی ترقی میں خطرات پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن نفس ترقی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ قدم قدم پر اس کے بے شمار کرشمے نظر آتے ہیں۔ جو راحتیں سہولتیں کل تک خواب و خیال سے باہر تھیں وہ آج معمولات میں داخل ہیں کہ گویا کوئی بات نہیں۔ جو تکلفات کبھی امیروں کو میسر نہ تھے وہ آج غریبوں کی ضروریات شمار ہوتے ہیں۔

زمان و مکان یہی دو اعتبار ہیں جو انسان کے تعلقات میں بُعد اور فصل پیدا کرتے ہیں۔ سو مکان اس درجہ قابو میں آگیا ہے کہ گویا زمین کی طنابیں کھنچ گئیں۔ برسوں کے سفر دنوں میں اور مہینوں کے سفر گھنٹوں میں طے ہوتے ہیں۔ سرعت رفتار ترقی پر ہے۔ وہ دن دُور نہیں جب آمد و رفت اور رسل و رسائل کے لحاظ سے دنیا کے ممالک کسی قدیم بڑے شہر کے محلّے معلوم ہوں۔ اور بات چیت کے لحاظ سے تو آج بھی دنیا کے ممالک ایک ہی مکان کے کمرے معلوم ہوتے ہیں اور عجیب نہیں کہ عن قریب سب ایک ہی دیوان خانہ بن جائیں کہ گویا پاس بیٹھے آنکھوں کے سامنے بات چیت ہو۔ صرف ہاتھ ملانے کی کسر رہ جائے اور شاید وہ بھی کبھی پوری ہو جائے۔ مکان سے بڑھ کر زمان پر تصرف بڑھ رہا ہے۔ برسوں کے کام منٹوں میں انجام پاتے ہیں اور بمقدار کثیر انجام پاتے ہیں۔ اگر کام کی انجام دہی کے لحاظ سے عمر کا حساب لگایا جائے تو آج کل کام کرنے والوں کی عمریں پہلے لوگوں کی

عمروں سے ہزار ہا درجہ بڑی ثابت ہوں گی۔

خلاصہ یہ کہ زمان و مکان کے بُعد و فصل بہت کچھ گھٹے اور گھٹ رہے ہیں۔ انسانی اجتماع اور تعاون بہت کچھ بڑھا اور بڑھ رہا ہے۔ ساتھ ساتھ تمدن بھی ترقی کر رہا ہے البتہ مادی پہلو غالب ہے۔ اخلاقی اور روحانی پہلو مغلوب ہے۔ جس سے توازن بگڑ رہا ہے اور عدم توازن حد سے گزرا تو پھر تمدن کی خیر نہیں۔ خواہ تمدن کیسا ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو۔ جب توازن بگڑ جائے اور بہت بگڑ جائے تو بڑے سے بڑا جہاز بھی اسی طرح ڈوبتا ہے جیسے کہ چھوٹی کشتی بلکہ اس کا ڈوبنا بہت زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ انسان کی زندگی میں اجتماع اور تعاون کی بدولت بے شمار گوناگوں تعلقات پیدا ہوگئے، وسیع پیمانہ پر پیدا ہوگئے اور بہت پیچیدہ ہوگئے۔ نتیجہ یہ کہ ان کو سنبھالنے اور سلجھانے کے لئے علوم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ معلومات تو پہلے بھی کسی نہ کسی شکل میں رائج تھے اور بعض علوم بھی ایک حد تک موجود تھے۔ لیکن ضروریات تمدن کی بدولت چند علوم وسیع پیمانہ پر باقاعدہ مرتب ہوگئے اور ہو رہے ہیں۔ جو انسان کے تعلقات سے بحث کرتے ہیں اور سوشل سائنس یا علوم عمرانی کہلاتے ہیں۔ گرچہ متمدن زندگی میں انسانی تعلقات اس درجہ ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں کہ ان کو جدا کرنا محال ہے تاہم ان میں تمیز کر سکتے ہیں۔ ایسی ہی مثال ہے کہ زمان و مکان، نور، حرارت، ہوا، آواز۔ یہ سب یکجا ملے جلے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کمرہ میں بیٹھکر ہم دیکھتے ہیں کہ دن کے بارہ بجے ہیں، کمرہ وسیع ہے، روشن ہے، گرم ہے، ہوا چل رہی ہے، آواز آرہی ہے۔ یہ سب اعتبارات ملے جلے یکجا موجود ہیں۔ مگر ہر ایک جداگانہ ملحوظ رہتا ہے۔ کبھی وقت کی طرف توجہ ہوتی ہے، کبھی مقام کی طرف اور کبھی دوسرے اعتبارات کی طرف کہ اُجالا ہے یا اندھیرا، گرمی ہے یا سردی، ہوا چل رہی ہے یا بند ہے، آواز آرہی ہے یا خموشی ہے۔ تقریباً یہی حال انسان کے تمدنی تعلقات کا ہے کہ ملے جلے ہیں پھر بھی نوعیت کے لحاظ سے ممیز ہو سکتے ہیں۔ یکجا موجود رہتے ہیں مگر جدا جدا ملحوظ ہوتے ہیں۔ مثلاً

حصول معاش کے ضمن میں جو گوناگوں تعلقات پیدا ہوں وہ معاشی تعلقات کہلاتے ہیں اور علم معاشیات ان ہی تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ بنک اور بازار میں ان تعلقات کا خاص مظاہرہ ہوتا ہے۔ حاکم ومحکوم یا حکومتوں کے درمیان جو تعلقات پیدا ہوں وہ سیاسی تعلقات کہلاتے ہیں اور علم سیاسیات ان ہی تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ پارلیمنٹ، سینٹ، اسمبلی اور کونسل میں ان تعلقات کا خاص مظاہرہ ہوتا ہے۔ انسانوں کے حقوق وفرائض سے جو تعلقات پیدا ہوں، وہ حکومت کے زیر نگرانی قانونی تعلقات کہلاتے ہیں اور علم قانون ان ہی تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ سرکاری عدالتوں میں ان تعلقات کا خاص مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہی تعلقات سوسائٹی کے زیر نگرانی اخلاقی تعلقات کہلاتے ہیں۔ اور علم اخلاق ان ہی تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ برادری کی پنچایتوں میں ان تعلقات کا خاص مظاہرہ ہو سکتا ہے۔ وہی تعلقات ایک اعلیٰ ہستی یعنی خالق کے زیر نگرانی دینی تعلقات کہلاتے ہیں اور علم دینیات ان ہی تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ مسجد، مندر اور گرجا میں ان تعلقات کا خاص مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان سب تعلقات کے سوا جو رہے سہے معاشرتی تعلقات پیدا ہوتے ہیں، وہ عمرانی تعلقات کہلاتے ہیں اور علم عمرانیات ان تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ گھروں میں ان تعلقات کا خاص مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس طرح گویا بے شمار تمدنی تعلقات چند انواع میں تقسیم ہو گئے اور ہر نوع ایک علم کے تفویض ہو گئی۔ اس طرح معاشیات، سیاسیات، قانون، اخلاقیات، دینیات اور عمرانیات۔ متعدد علوم عمرانی قرار پائے۔

یہ تمدنی تعلقات بہت قدیم ہیں۔ لیکن ان میں جو وسعت اور پیچیدگیاں پیدا ہوئیں وہ جدید ہیں۔ علیٰ ہذا ان تعلقات کی بابت معلومات بھی قدیم ہیں۔ لیکن ان کے متعلق باقاعدہ علوم حال میں مدوّن ہوئے اور ہو رہے ہیں یا جو علوم سابق میں مدوّن ہو چکے تھے وہ ترقی پا رہے ہیں۔ قدیم زمانہ کے تمدنی تعلقات کو معلومات سے نبھانا ایسا ہی تھا کہ کسی ساگر یا تالاب میں کشتی چلانا۔ جدید تمدنی تعلقات کو علوم پر سنبھالنا ایسا ہی جیسے کہ سمندر میں دخانی جہاز چلانا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تمدن میں علوم عمرانی کی طرف خاص و عام بہت متوجہ ہیں اور ان میں بھی بالخصوص معاشیات اور سیاسیات بہت فروغ پا رہے ہیں کہ

یہی بجلی کی دو مثبت و منفی رَو یعنی کرنٹ ہیں جو مل کر جدید تمدن کی مشین چلاتی ہیں۔ باقی علوم عمرانی بھی ان کے طفیل میں ترقی پا رہے ہیں اور مادّی علوم مثلاً ریاضی، طبعیات اور کیمیا وغیرہ جو میدان ترقی میں بہت پیش پیش نظر آتے ہیں، وہ بھی در اصل ان ہی دو علوم یعنی معاشیات اور سیاسیات کے فرمائشات کی تعمیل میں مصروف ہیں اور سچ پوچھئے تو خود سیاسیات بھی معاشیات کے اشارہ پر چلتی ہے۔ پس معاشیات کو جو اہمیت اور تقدیم حاصل ہے، ظاہر ہے۔

واضح ہوا کہ متمدن زندگی کے سب شعبے معاشی، سیاسی، قانونی، اخلاقی، دینی اور معاشرتی، ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں اور اس باہمی تاثر کا تخمین و تجزیہ نہایت نازک اور دقیق فن ہے جس طرح علوم طب کی مدد سے جسم انسان کے امراض کی تشخیص و اصلاح کی جاتی ہے، علوم عمرانی کی مدد سے تمدن کی خرابیوں کی بھی اسی طرح تشخیص و اصلاح کرنی ضرور ہے۔ اگر علوم کی مدد بغیر محض جذبات و قیاسات سے کام لیا جائے تو عجب نہیں کہ خرابیوں میں اور اضافہ ہو کر پیچیدگیاں بڑھ جائیں۔ جس طرح کہ عطائی علاج سے اکثر اوقات مرض بڑھ جاتے ہیں۔ چونکہ آج کل اصلاح تمدن کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور لوگ اس بارے میں بے چین ہیں، اس لئے انتباہ ضرور ہے کہ اصلاح میں علمی وسعت نظر اور دقّت نظر سے کام لیا جائے۔ ورنہ اناڑی تجربوں کا انجام خراب ہوگا۔

تفصیلات سے قطع نظر جس بندش نے تمدن کو کس رکھا ہے وہ حقوق و فرائض کا تعلق ہے۔ اگر یہ بندش ڈھیلی پڑ جائے تو تمدن میں بھی لازماً ڈھیل پڑ جائے گی اور اگر خدانخواستہ یہ بندش ٹوٹ جائے تو تمدن کی پراگندگی بھی لازم ہے۔ ہر حق کا دوسرا رُخ فرض ہوتا ہے اور ہر فرض کا دوسرا رُخ حق۔ یہ دونوں رُخ گویا لازم و ملزوم ہیں۔ حقوق و فرائض کے متعلق عہد جدید نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ اوّل تو بالعموم حقوق و فرائض کے آثار و ثمرات چند روزہ زندگی تک محدود قرار دیئے گئے۔ جس سے ان کی اہمیت میں لازماً تخفیف ہو گئی۔ دوسرے ان کی نگرانی بھی انسانی عدالتوں تک محدود کر دی گئی

جس سے گریز کی کافی گنجائش نکل آئی۔ تیسرے حقوق کے مطالبہ کو مقدم رکھا گیا اور فرائض کی تعمیل کو مؤخر۔ جس سے لازماً کش مکش بڑھ گئی۔ حالانکہ اگر فرائض کی تعمیل کو مقدم کر دیا جائے تو حقوق کی تکمیل خود بخود ہو جائے اور بطریق احسن ہو جائے۔ چوتھے یہ کہ حقوق قوی جماعتوں کے اجارے میں آ گئے اور فرائض کمزور جماعتوں کے گلے پڑے۔ حالانکہ فلاح تمدن کے واسطے تقسیم اس کے برعکس ہونی چاہیئے۔ یعنی کمزور جماعتوں کی طرف حقوق کا پلہ بھاری رہے اور قوی جماعتیں فرائض کا بار اپنی طرف زیادہ رکھیں، تاکہ تمدن میں صحیح توازن قائم رہے۔ موجودہ تمدن میں باہمہ اہتمام جو انتشار نمودار ہوا چاہتا ہے اس کا خاص سبب یہی حقوق و فرائض کی بے اعتدالی ہے اور اگر اس خرابی کی اصلاح نہ ہوئی تو تمدن کی بھی خیر نظر نہیں آتی۔

عجب نہیں بظاہر یہ معلوم ہو کہ تمہید کو طوالت دی گئی۔ لیکن بعض تصاویر بغیر پس منظر کے بے معنی نظر آتی ہیں۔ ایسی صورت میں بقدر ضرورت پس منظر تصویر میں شریک کرنا ناگزیر ہوتا ہے اور وہ تصویر کا اہم جزو شمار ہوتا ہے۔ لہذا ضرور تھا کہ جدید تمدن کے علوم و آثار کا ایک مختصر اور سرسری خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ معاشیات اور معاشرت کے مسائل کا محل اور تناسب ظاہر ہو جائے اور صحیح اندازہ سے اصلاح میں کام لیا جائے۔

اب معاشیات کو لیجئے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے حصول معاش کے ضمن میں جو گوناگوں تعلقات پیدا ہوتے ہیں وہ معاشی تعلقات کہلاتے ہیں اور علم معاشیات ان ہی تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ ان تعلقات میں حد درجہ وسعت اور عمومیت ہے۔ طفل شیرخوار سے لے کر پیر فرتوت تک، امیر سے لے کر فقیر تک عالم سے لے کر جاہل تک تندرست سے لے کر مریض تک غرض کہ سب انسان مہد سے لے کر لحد تک بلکہ سچ پوچھئے تو مہد سے قبل اور لحد کے بعد بھی ان تعلقات میں بندھے ہوئے ہیں۔ دنیا میں آنے سے قبل ہی بچے کے واسطے معاشی اہتمام شروع ہو جاتا ہے اور دنیا سے جانے کے بعد بھی مختلف اشکال میں معاشی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کفن دفن ہے، نیاز و نذر ہے بلکہ بزرگوں کے دم سے تو زیارت گاہیں معاشی تعلقات کا مرکز بن جاتی ہیں۔ بہر حال تمدنی تعلقات میں

معاشی تعلقات کو بہت وسعت عمومیت اور لزوم حاصل ہے۔ تارک الدنیا جوگی جو کسی پہاڑ کی کھو میں الگ جا بیٹھتا ہے، وہ بھی کھانے پینے، روشنی اور ستر پوشی کی حد تک لازماً معاشی تعلقات سے کام لیتا ہے اور جدید تمدن کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اس نے تو معاشی ترقی کو اپنا واحد نصب العین قرار دے رکھا ہے۔ نت نئے ضروریات تجویز کرنا اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے نت نئے طریق وسامان ایجاد کرنا۔ گویا راحت وآسائش کے ساز وسامان سے دنیا کو جنت بنا دینا۔ لیکن چونکہ فی الحقیقت مسرت واطمینان کا منبع باطن میں ہے اور وہ منبع عدم التفات سے اَٹ گیا ہے، باہمہ ساز وسامان مسرت واطمینان کا فقدان ہے۔ عقل حیران اور دل پریشان ہے۔ تمام عالم میں ہیجان ہے۔

معاشیات کے تحت اصلاح معاشرت مقصود ہو تو ایک ہی سوال پیدا ہوتا ہے جو سب پہلوؤں پر حاوی ہے۔ وہ یہ کہ آمدنی اور خرچ میں کیا تناسب ہے اور کس طرح قائم کیا جائے کہ زندگی ایمان داری اور خودداری سے بسر ہو۔ اصل اصول سب کو معلوم ہے کہ آمدنی خرچ سے بڑھی رہے یا خرچ آمدنی سے گھٹا رہے۔ اگر خرچ بڑھانے کی خواہش ہو تو آمدنی بڑھانے کا حوصلہ اور موقع ہونا چاہیئے اور اگر آمدنی بڑھانے کا حوصلہ اور موقع نہ ہو تو کمتر خرچ پر قانع رہنا چاہیئے۔ یہی دو صورتیں ہیں جو قرینِ اصول اور قرینِ مصلحت ہیں۔ لیکن ایک تیسری صورت جو پس ماندہ ممالک میں تباہی پھیلا رہی ہے وہ یہ ہے کہ آمدنی بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہے اور خرچ گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا ہے اور اس عدم توازن سے جو کمی پڑتی ہے وہ قدیم آبائی اندوختوں سے پوری کی جاتی ہے خواہ وہ زر وجواہر کی شکل میں ہوں، نقد رقم کی شکل میں یا جائداد کی شکل میں۔ اس صورت سے کچھ مدت کام چلتا ہے اور خوش حالی کا دھوکا رہتا ہے۔ لیکن لازمی انجام تباہ حالی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں بڑے بڑے متمول خاندان اس طرح تباہ ہوئے اور تباہ ہو رہے ہیں۔ خاص کر مسلمان اسراف کی بلاؤں میں زیادہ پھنسے۔ وجہ یہ کہ حکمرانی سے محکومی میں گرے اور بری طرح گرے۔ لیکن معیار زندگی وہی حکمرانی کا برقرار رکھنا چاہا اور اس کو لازمۂ وضعداری سمجھا۔ ایک دو پشت یہ نمائشی وضعداری نبھ گئی اور اس

دوران میں نقدیاں ختم ہوگئیں، جائدادیں فروخت یا نیلام ہوگئیں۔ افلاس کا دور شروع ہوگیا۔ ہزارہا شریف خاندان اس بھنور میں ڈوب گئے اور اب بھی بہت سے اس میں پڑے چکّر کھارہے ہیں، نکلنا دشوار نظر آتا ہے۔

آمدنی کے ذرائع اجمالی طور سے دیکھئے تو چار مدّات نظر آتی ہیں۔ اوّل سب سے بہتر معاشی کمائی ہے جس کی تین شکلیں ہیں: زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت، آمدنی کی دوسری مد چوری اور سینہ زوری ہے جس میں سرقے اور غبن کے سوا رشوت بھی داخل ہے۔ خواہ وہ دوستانہ تحفہ تحائف کی مہذب شکل میں وصول کی جائے۔ آمدنی کی تیسری مد بھیک اور خیر خیرات ہے جس میں سب نہیں لیکن پھر بھی کافی حد تک قومی چندے اور مذہبی نذریں داخل ہوسکتی ہیں اور چوتھی مد لوگ کہتے ہیں کہ دست غیب ہے، لیکن وہ غیب ہی کیا جس کا پتہ چل جائے۔ بہت سے اس کی تلاش میں خود ہی غائب ہوگئے۔ بہرحال آمدنی کی بہترین مد معاشی کمائی ہے۔ جس قوم کے بیشتر افراد معاشی ذرائع سے آمدنی پیدا کریں گے وہ قوم خوش حال رہے گی اور جہاں دوسری مدوں کی آمدنی پر بسر اوقات ہو لامحالہ وہاں آج نہیں تو کل افلاس پھیل جائے گا۔

کمائی کے معاشی ذرائع میں زراعت کی جو ابتر حالت ہے محتاج بیان نہیں۔ تفصیلات سے تو تصانیف بھری پڑی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ شعبۂ زراعت میں پہلے ہی اتنا ہجوم ہے کہ کسی اضافہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ملک کی تین چوتھائی آبادی زراعت پر گزر کر رہی ہے اور اس کا بیشتر حصہ خستہ حال ہے۔ اصلاح و ترقی کی تجاویز پیش ہو رہی ہیں تاہم یہ توقع نہیں کہ مزید آبادی اس کو ذریعہ معاش بنا سکے گی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جو لوگ اس کو ذریعہ معاش بنا چکے ہیں ان کی حالت کچھ سدھر جائے اور موجودہ خستہ حالی رفع ہو۔

کاشتکار، زمیندار، ساہوکار اور سرکار میں چوگڈا پیچ پڑا ہوا ہے۔ اس پیچ کا نکلنا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کش مکش میں زمیندار کی حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی ہے۔ اس کی ملک اور آمدنی دونوں خطرے میں ہیں۔ ساہوکار کی بھی

روک ٹوک ہو رہی ہے۔ لیکن لین دین جاری ہے اور جاری رہے گا۔ البتہ ساہوکار کے من مانے تصرفات باقی نہیں رہ سکتے۔ سرکار کی توجہات کاشتکار پر روز افزوں ہیں۔ گویا کہ دل سے محبت اُبل رہی ہے۔ لیکن اس محبت کا بُرا ہو وہاں بھی رقابت آ دھمکی۔ چنانچہ سیاسی لیڈروں کی بھی خواہش اور کوشش ہے کہ کاشتکار کے ہمدرد بنیں اور اس کا دل اپنے ہاتھ میں لیں۔ نتیجہ یہ کہ کاشتکار کا ایک ہاتھ سرکار کے ہاتھ میں اور دوسرا ہاتھ سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھیں کون اس کو کھینچ کر اپنی طرف لے جائے ؟

کمائی کا دوسرا ذریعہ صنعت و حرفت ہے۔ جب سے بڑے بڑے کارخانے کھلے اور بدیسی سامان ارزاں بکثرت آنے لگا، ملک کی چھوٹی اور گھریلو صنعتیں پامال ہو گئیں۔ روزی کے بہت سے دروازے بند ہو گئے۔ یوں تو صنعت و حرفت کی تفصیل بہت طویل ہے پھر بھی متعدد مروجہ پیشے ایسے ہیں جن میں اصلاح و ترقی کی کافی گنجائش موجود ہے۔ مثلاً سنگ تراش ہیں، معمار ہیں، بڑھئی ہیں، لوہار ہیں، رنگریز ہیں، درزی ہیں، دھوبی ہیں، سُنار ہیں، حجام ہیں، موچی ہیں، باورچی ہیں، دست کار ہیں۔ یہ سب طبقے بالعموم جاہل ہیں اور یہ سب پیشے رسماً رذیل سمجھے جاتے ہیں۔ ہندو تعلیم کے زیر اثر پیشے ذات شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی نے درزی کا کام کیا تو گویا اس کی ذات درزی ہو گئی اور کسی نے سُنار کا کام کیا تو اُس کی ذات سُنار ہو گئی۔ لیکن اسلامی تعلیم نے حلال و حرام کا معیار قرار دے کر اکل حلال کو باعثِ عزت اور اکل حرام کو باعث ذلت قرار دیا۔ پیشہ کا ذات سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ تعظیم و تکریم کا مدار تقویٰ پر رکھا جس سے مراد علم صحیح اور عمل صالح کا اجتماع ہے۔ غرض کہ عام مفید پیشوں سے جو ذلت وابستہ ہو گئی تھی اسلام نے اس کو رفع کر دیا۔ چنانچہ خود بزرگانِ دین نے مختلف پیشے اختیار کر کے عملی طور پر پیشوں کی توقیر قائم کی اور بنی نوع انسان کے واسطے حصول معاش کے ذریعے پاک اور وسیع کر دیئے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے ہندوؤں میں ذات پات اور پیشوں کی بندشیں نسبتاً ڈھیلی پڑ گئیں اور مسلمانوں میں یہ تفریقات نئے سرے سے

داخل ہو کر پھیل گئیں۔ گویا فریقین نے فریقین کو متاثر کیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ تنگ دستی گوارا لیکن پیشے اختیار کرتے جھجکتے ہیں کہ مبادا ان کی ذات نیچی ہو جائے۔ حالانکہ اسلامی ممالک میں لوگ اب بھی حسب ضرورت ایسے پیشے اختیار کرتے ہیں جن سے اکل حلال حاصل ہو۔ جو پیشے ہندوستان میں رذیل سمجھے جاتے ہیں، یورپ میں ان پیشوں کی جو قدر ہے اور ان سے معاش میں جس درجہ وسعت پیدا ہوئی ہے وہ بہت سبق آموز ہے۔ غرض وقت آگیا ہے کہ شریف نوجوان اپنی آستینیں چڑھائیں اور پیشوں میں لگ جائیں۔ ذات بگڑنے کا خوف دل میں نہ لائیں۔ ایمان داری، ہوشیاری اور مستعدی سے کھائیں کمائیں۔ بے کاری اور ناداری سے نجات پائیں۔

چوں کہ صدیوں حکمراں رہے مسلمانوں کو اب بھی سرکاری نوکری کا شوق ہے۔ خاص کر جس ملازمت میں حکومت کا موقع زیادہ ملے اور اپنی طبعی مناسبت سے حکومت کے عہدوں پر نسبتہً بہتر کارگزار ثابت ہوتے ہیں لیکن اول تو انھوں نے جدید تعلیم شروع کرنے میں دو پشت تاخیر کی ان کے داخل ہونے تک ملازمت کے علاقے گھر چکے تھے کچھ منت سماجت اور کچھ ڈراوے دھمکاوے سے تھوڑی جگہ مل گئی لیکن ملازمت کی بھی ایک حد ہے آخر پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ملازموں میں تخفیف کی نوبت آرہی ہے تو پھر امیدواروں کا کیا ٹھکانا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں سے دست کش اور مایوس ہو جائیں۔ بقدر گنجائش داخلہ کی کوشش کریں اور ضرور کریں۔ حکومت میں ان کی شرکت بہر صورت ضرور ہے۔ البتہ یہ مناسب نہیں کہ سب سرکاری ملازمت کے پیچھے پڑ جائیں اور نہ یہ ممکن کہ سب اس میں داخل ہو جائیں۔ جن کو سرکاری ملازمت کا موقع ملے ملے۔ باقی پیشوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔ دولت مند نہ بنیں پھر بھی آبرو اور اطمینان سے بسر کر سکتے ہیں۔ آج بھی ہوشیار کاریگروں کی قلت ہے کام خوبی اور سلیقے سے کریں تو معمار، بڑھئی، درزی، دھوبی، موچی، باورچی اور سنار وغیرہ بسہولت اتنی معاش پیدا کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں کہ ایک گریجویٹ کو معمولی طور پر سرکاری ملازمت میں میسر آنا دشوار ہے۔

رہا کمائی کا تیسرا معاشی ذریعہ جس کو تجارت کہتے ہیں۔ اس میں ہندوستانیوں کا حصہ بہت کم ہے اور ہندوستانیوں میں مسلمانوں کا حصہ اس سے بھی کم ہے جس پیمانہ پر آج تجارت چلتی ہے اس کے واسطے بڑے سرمایے اور بڑے جتھے کی ضرورت ہے۔ بالعموم ہندوستانیوں کے پاس سرمایہ کم ہے اور بالعموم مسلمانوں کا تجارتی جتھوں میں گزر مشکل ہے۔ تجارت کے نام سے ہندوستانی جو کام کرتے ہیں وہ دراصل ایجنسی ہوتی ہے اور اس کے تحت خردہ فروشی چلتی ہے لیکن تجارت کی کنجی ہندوستانیوں میں بھی بالعموم یوروپین کمپنیوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے واسطے تصانیف درکار ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تجارت اتنی آسان نہیں جتنی کہ ناتجربہ کاری سے آسان سمجھی جاتی ہے۔ سرمایے اور جتھے بندی کے سوا اس کام میں وسیع معلومات اور کثیر تجربہ کی ضرورت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں کاروباری تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام ہے لیکن ہندوستان میں ایسے مواقع بہت کم یاب ہیں۔ پھر بھی ایجنسی اور خردہ فروش تجارت میں تعلیم یافتہ نوجوان اپنی جگہ نکال سکتے ہیں۔

آمدنی کے ان معاشی ذرائع کے ساتھ رقمی لین دین بھی کاروبار کی ایک خاص صورت ہے اور عہد جدید میں اس کاروبار کو حد درجہ فروغ ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے بغیر زراعت ہو، صنعت و حرفت ہو یا تجارت ہو کوئی معاشی کاروبار چلنا دشوار بلکہ محال ہے۔ چنانچہ ساہوکاروں کے سوا بڑے بڑے بنک یہ کام انجام دیتے ہیں۔ رقم لینے دینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک شرکت، دوسرے قرضہ۔ شرکت کی صورت میں بشرط گنجائش منافع ملتا ہے جو پہلے سے غیر معین رہتا ہے۔ قرضہ کی صورت میں لازماً سود ملتا ہے جو پہلے سے معین کر دیا جاتا ہے۔ فقہ اسلام کی رو سے منافع تو ہر طرح جائز ہے۔ البتہ سود میں کلام ہے۔ بڑی جماعت اس کو ربوا کے تحت ناجائز قرار دیتی ہے اور چھوٹی جماعت اس کو ربوٰ سے خارج سمجھ کر جائز قرار دینا چاہتی ہے۔ بلکہ ربوٰ میں داخل مان کر بھی دیگر شرعی عذرات کی بنا پر اس کے جواز کا فتویٰ دیتی ہے۔ بہر حال سود کے مسئلہ میں اختلاف ہے اور اکثریت اس کے جواز کے خلاف ہے۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ شرعاً تو سود لینا سود دینا دونوں امر ناجائز قرار دیئے جاتے ہیں لیکن تمام تر زور سود نہ لینے پر

دیا جاتا ہے۔ سود دینے کی ذرا بھی روک ٹوک نہیں ہے۔ چنانچہ علانیہ مسلمان سود پر قرض لیتے اور سود دیتے ہیں مگر ذرا بھی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ اگر مسلمان کہیں سود لے بیٹھیں تو وہ مطعون کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ جو متمول اور محتاط مسلمان بنکوں میں رقم رکھتے ہیں وہ اپنی رقم کا سود بنکوں میں چھوڑ دیتے ہیں اور وہ لاکھوں روپیہ کی تعداد میں بالعموم عیسائی مشنوں کو دے دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تبلیغ میں اس سے کام لیں۔ اگر یہ عذر کیا جائے کہ قرض دینا حالت اختیاری ہے اور قرض لینا حالت مجبوری۔ تو اول تو سب قرض بحالتِ مجبوری نہیں لئے جاتے بلکہ اکثر بغرض منفعت لئے جاتے ہیں۔ دوم شرع شریف کی تعمیل مقصود ہو تو قرض حسنہ کا اہتمام بھی ممکن ہے اور اگر پہلے سے سود کی شرط نہ لگائی جائے تو قرض گیر قرض حسنہ کی صورت میں بھی بطور شکر گزاری اپنی خوشی سے بقدر مناسب زائد رقم ادا کر سکتا ہے اور اس طرح رقمی لین دین کی ایک آسان صورت نکل سکتی ہے۔ بہر حال سود کا مسئلہ جلد از جلد تصفیہ چاہتا ہے اور یہ تصفیہ زیادہ تر علمائے دین سے تعلق رکھتا ہے۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے بھی معاشیات میں سود کے جواز کے متعلق اختلاف ہے۔ معاشئین کی ایک جماعت اس کو تمدن کے حق میں مفید اور جائز سمجھتی ہے تو دوسری جماعت اس کو ناجائز اور مضر قرار دیتی ہے اور منافع کو دونوں جماعتیں سود پر ترجیح دیتی ہیں۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ جدید نظام کاروبار میں سود لابد اور ناگزیر بنا ہوا ہے اور اس سے خلاصی بہت دشوار نظر آتی ہے۔

آمدنی کے بعد اب خرچ کو لیجئے۔ اس کا اصول وہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ خرچ بڑھانے کا شوق ہو تو آمدنی بڑھانے کا حوصلہ اور موقع ہونا چاہئے اور آمدنی نہ بڑھ سکے تو کمتر خرچ پر قناعت کرنی چاہیئے۔ ورنہ خرچ کو آمدنی سے بڑھانے کا نتیجہ معلوم ع

چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے

کسی فرد یا خاندان کو جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں وہ مجموعی طور پر معیارِ زندگی کہلاتی ہیں۔ اگر ضروریات قلیل اور ادنیٰ ہیں تو گویا معیار زندگی

پست ہے اور اگر ضروریات کثیر اور اعلیٰ ہیں تو گویا معیار زندگی بلند ہے۔ ضروریات زندگی کثیر ہوں اور اعلیٰ ہوں، معاشی ترقی اسی کا نام ہے۔ تہذیبِ جدید کا یہی خاص پیام ہے۔

قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ معیار زندگی کا صحیح اصول کیا ہے۔ اس معاملہ میں دو گروہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ ایک گروہ نے دنیا ہی کو سب کچھ سمجھا اور اور اس کے حصول میں ہمہ تن منہمک ہو گیا کہ ایمان و اخلاق، دین و عقبیٰ سب فراموش ہو گئے۔ گویا یہ گروہ دنیا میں غرق ہو گیا۔ دوسرے گروہ نے دنیا کو سراسر ہیچ سمجھا اور اس سے حتی الوسع احتراز کیا کہ جوگ اور رہبانیت تک نوبت پہنچ گئی۔ اس گروہ نے ایمان و اخلاق کی ترقی اور دین و عقبیٰ کی فلاح کے واسطے ترک دنیا کو مفید مطلب بلکہ لازم قرار دیا۔ گویا یہ گروہ دنیا سے کنارہ کش رہا۔

تیسرے گروہ نے معیار زندگی کے متعلق ایک اصولی مسلک پیش کیا۔ اس نے علم صحیح اور عمل صالح پر زور دیا اور حصول دنیا کی کمی بیشی کو لوگوں کے حوصلے پر چھوڑ دیا۔ گویا خوبی اور خرابی کا معیار علم و عمل قرار پایا۔ دنیا کی قلت و کثرت سے اس کا کوئی لازمی تعلق نہیں رہا ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

چونکہ علم و عمل کا ظہور دنیوی تعلقات میں زیادہ ہوتا ہے، اس لئے اس گروہ نے تحصیل دنیا کو ترک دنیا پر ترجیح دی کہ علم و عمل کا کمال ظاہر ہو۔ چنانچہ انسانیت کے بہترین نمونے نبی اور رسول مانے جاتے ہیں۔ ان میں بادشاہ بھی ہوئے، وزیر بھی ہوئے۔ سپہ سالار بھی ہوئے، دنیادار بھی ہوئے یعنی ان کے بیوی بچے تھے، گھربار تھے، کاروبار تھے۔

اگر دنیا کو ایک دریا مانا جائے تو ان تینوں گروہوں کی ایسی مثال ہے کہ ایک

دریا میں کودا اگر تیراک نہ تھا۔ ہاتھ پیر مار کر ڈوب گیا۔ دوسرا دریا کے کنارے بیٹھا رہا۔ ڈوبنے کے خوف سے دریا میں نہ اُترا۔ تیسرے نے تیراکی کا فن سیکھا اور دریا میں اتر کر خوب کمال دکھایا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ پانی انسان کو لازماً ڈوباتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت انسان عدم توازن سے ڈوبتا ہے اگر اس کا توازن صحیح قائم ہو جائے تو خود پانی میں ایک سنبھالنے والی قوت پوشیدہ ہے۔ توازن صحیح کے ساتھ جب اس سنبھال کا ربط قائم ہو جاتا ہے تو پھر ڈوبنا اتنا ہی دشوار ہو جاتا ہے جتنا کہ تیرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہی ربط سکھاتی ہے۔ الوہیت اور رسالت جن کا خلاصہ کلمۂ توحید ہے جب علم و عمل میں ان کا توازن قائم ہو جائے تو اس حالت کو عبدیت کہتے ہیں۔ گویا عبد دنیا کا تیراک ہے اور تیرتے وقت اس کو جو دنیا میں باطنی سنبھال محسوس اور منکشف ہوتی ہے وہ اصطلاحاً ربوبیت کہلاتی ہے جو رب کی طرف سے آتی ہے۔ اسلام کی تعلیم کا منشا یہی ہے کہ عبد مومن کے علم و عمل میں الوہیت و رسالت کا صحیح توازن پیدا کرے۔ رب کی ربوبیت سے اس کا ربط منکشف کر دے کہ پھر وہ بے تکلف دنیا میں تیرے، غوطے لگائے اور صحیح سالم ساحل مراد تک پہنچ جائے۔ یہی مراد ہے اس قرآنی دعا سے رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔

تیراکی سیکھنے کے بعد اگر کوئی کشتی میں بیٹھ کر سفر کرے تو مضائقہ نہیں بلکہ مفید ہے۔ لیکن تیراکی سیکھے بغیر کشتی میں سفر کرنا خالی از خطر نہیں۔ نہ معلوم کب اور کہاں کشتی جواب دے دے۔ اسباب سے کام ضرور لینا چاہئے اور خوب لینا چاہیئے لیکن مسبب سے ربط معلوم کر لینا مقدم ہے کہ بہر صورت اس کی ضرورت ہے۔

حاصل کلام یہ کہ بجائے خود معیار زندگی کی پستی اور بلندی میں کوئی خوبی یا خرابی نہیں بلکہ خوبی اور خرابی اس علم و عمل میں مضمر ہے جس کے تحت دنیا بسر کی جاتی ہے اگر علم و عمل درست ہے تو بادشاہ، وزیر، امیر سب کچھ بنئے۔ اگر علم و عمل درست نہیں ہے تو پھر جوگی اور فقیر بننے سے بھی کچھ فائدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان ہے کہ خسر الدنیا والآخرة

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض مشہور و مسلم بزرگان دین نے ایسی

زندگی بسر کی کہ گویا دنیا سے الگ رہے تو پھر کیا یہ ان کے کمال کا نقص تھا۔ اس معاملہ میں چند امور وضاحت طلب ہیں۔ انسانیت کا سب سے اعلیٰ کمال نبوت و رسالت ہے۔ نبی اور رسول بقدر امکان خالق اور مخلوق دونوں کی طرف متوجہ رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔ نبوت و رسالت کے بعد ولایت ہے۔ اس درجہ میں توجہ نسبتہً خالق کی طرف زیادہ رہتی ہے اور مخلوق کی طرف کم۔ بلکہ بہت کم۔ اگر توجہ مخلوق کی طرف سے بالکل ہٹ جائے تو وہ گویا عقبیٰ یا توحید کا جذب ہے۔ غفلت کی حالت ولایت کے برعکس ہے۔ اس میں توجہ نسبتہً مخلوق کی طرف زیادہ رہتی ہے اور خالق کی طرف کم بلکہ بہت کم اور اگر توجہ خالق کی طرف سے بالکل ہٹ جائے تو وہ گویا دنیا کا جذب ہے۔ چنانچہ عقبیٰ اور توحید کے مجذوب تو شاذ نظر آتے ہیں۔ لیکن دنیا کے مجذوبوں کی کمی نہیں بلکہ یہ جذب روز افزوں ہے اور تہذیب جدید کے معیار میں یہی جذب بڑا کمال مانا جاتا ہے۔

غرض کہ جو بزرگانِ دین نبوت و رسالت کے مقابل ولایت سے قوی نسبت رکھتے تھے وہ دنیا کی طرف کم ملتفت نظر آتے تھے۔ دوسرے یہ کہ گو اپنی باطنی نسبت کے تحت اپنی ذات کی حد تک وہ دنیا سے کم تعلق رکھتے تھے۔ لیکن تمام عمر دنیا داروں کی اصلاح و فلاح میں بسر کرتے تھے۔ گویا بالواسطہ دنیا میں مشغول تھے۔ تیسرے یہ کہ ترک دنیا کو اعلیٰ مقصد سمجھ کر بعد کے معتقدین نے ان بزرگوں کے حالات و معاملات کو رہبانیت کے رنگ میں پیش کرنا مفید مطلب سمجھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کی رو سے دین و دنیا میں قوی ربط و اتحاد ہے۔ ایک دوسرے کا ممد و معاون ہے، جو کچھ خوبی اور خرابی کی تفریق پیدا ہوتی ہے وہ علم و عمل میں مضمر ہے۔

میرا مقصد دینیات کی تبلیغ نہیں ہے نہ یہ اس کا محل ہے اور نہ میں اس کا اہل ہوں تاہم جب کہ معاشیات کے تحت اصلاح معاشرت کی بحث ہو، دینیات کے حوالے سے مفر نہیں کیونکہ زندگی کے نصب العین میں اس کو بہت بڑا دخل ہے اور اس کو نظر انداز کرنا گویا بحث کو بے جان کرنا ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے ابتدا میں مختصراً علوم عمرانی کا باہمی تاثر واضح کر دیا کہ خلط مبحث کا شبہ پیدا نہ ہو۔ بلکہ محسوس ہو کہ زندگی کے مختلف پہلو

ایک دوسرے سے ممیز ہونے کے باوجود کس درجہ ملے جلے ہیں اور کس درجہ باہم اثر منتقل کرتے ہیں اور قبول کرتے ہیں۔

بہرحال معیار زندگی جیسا کچھ بھی ہو، انسان کی جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں وہ اصولاً چار درجوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ اوّل ضروریات حیات، دوم ضروریاتِ کارکردگی، سوم ضروریاتِ راحت، چہارم ضروریات عیش۔ ضروریات حیات وہ ہیں جن کے بغیر زندگی دشوار ہے۔ مثلاً: ہوا، روشنی، پانی، کھانا۔ ضروریات کارکردگی وہ ہیں جن کے بغیر کام خوبی سے انجام دینا دشوار ہے۔ مثلاً: صحت، قوت، تعلیم تربیت۔ ضروریات راحت وہ ہیں جو محنت کے بعد آرام پہنچائیں اور صحت و طبیعت کو درست رکھیں۔ مثلاً: سیر و تفریح۔ ضروریات عیش وہ ہیں جن میں لذّت نفس کی خاطر دولت اور وقت کو بے دریغ صرف کیا جائے جیسی کہ کوتہ اندیش امیروں اور دولت مندوں کی حالت ہوتی ہے کہ اول دن عید اور رات شب برات ہے اور پھر ہیہات ہیہات ہے۔

ہر ملک کے قدرتی حالات مثلاً موسم کی نرمی، سختی، آب و ہوا کی خوبی خرابی اور ہر قوم کے تمدنی حالات مثلاً امن و بدامنی، کام کی کثرت و قلت، محنت کی افراط و تفریط تمول کی بیشی کمی۔ ان خصوصیات پر ضروریات کی تقسیم کا مدار ہوتا ہے۔ مثلاً سرد ممالک میں لباس ضروریات حیات میں داخل ہے۔ حالانکہ گرم ممالک میں اس کو یہ اہمیت حاصل نہیں۔ جن ممالک میں بدامنی ہو وہاں ہتھیار بھی ضروریاتِ حیات شمار ہوتے ہیں۔ حالانکہ پرامن ممالک میں وہ سیر و شکار کے واسطے ضروریاتِ راحت میں داخل ہیں۔ جن ممالک میں کاروبار عروج ہو لوگ صبح سے شام تک بڑے بڑے دفاتر اور کارخانوں میں کام کریں اور محنت سے معاش پیدا کریں وہ جسمانی اور دماغی تکان رفع کرنے کے واسطے اگر شام کو یا شب کو کھیل تماشے دیکھیں تو ان کے واسطے یہ مشغلے بڑی حد تک ضروریات راحت بلکہ ضروریات کارکردگی میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ تمام دن بے کاری میں بسر کریں وہ دوسروں کی تقلید میں یہ مشاغل اختیار کریں تو کھلی عیش پرستی ہی اس کو راحت یا کارکردگی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ ضروریات کی اس فطری اضافیت کو نہ سمجھنے سے ترقی یافتہ

ممالک کی اندھی تقلید کرکے پس ماندہ ممالک سخت مالی اور اخلاقی نقصان اُٹھا رہے ہیں مثلاً موٹر کو لیجیئے۔ ترقی یافتہ ممالک میں زندگی کی جو مصروفیت ہے اور تموّل کی جو نوبت ہے اس کے مدنظر ضروریاتِ زندگی نہیں تو بلا تکلف ضروریات کارکردگی میں داخل ہے۔ راحت تک بھی کم نوبت آتی ہے تو عیش کا کیا ذکر ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں موٹر بیشتر عیش یا کم از کم راحت میں داخل ہے۔ بمشکل کارکردگی تک نوبت آتی ہے۔ اگرچہ ترقی یافتہ ممالک کے مقابل یہاں موٹروں کی بہت کمی ہے۔ تاہم یہ قلیل تعداد بھی معاش و معاشرت پر بار معلوم ہوتی ہے۔ موٹر نشینی کی اکثر صورت یہ ہے کہ جسم موٹر پر سوار اور موٹر دل و دماغ پر سوار۔ عجب لطف ہے۔ عجب بے لطفی ہے۔ موٹر تو پھر بھی کارآمد ہے۔ مغربی زندگی کے جو دوسرے تکلفات رائج کئے جا رہے ہیں وہ ہندوستانی زندگی میں سراسر بے محل ہیں۔ مثلاً تفریحات کا جو شعبہ کھلا ہے وہ حالات حاضرہ کے مدنظر عیش کی دعوت عام ہے اور معلوم ہے کہ عیش کا کیا انجام ہے۔ یہی سینما جس سے مغربی ممالک بڑے بڑے کام لیتے ہیں ہندوستان میں کیا کیا نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ ملک اور قوم کے حالات کے مطابق ضروریات اضافی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ لازماً سب جگہ یکساں آثار پیدا کریں، یکساں آثار مطلوب ہوں تو اول یکساں حالات پیدا کرنا لازم ہے۔

بہرحال اصول یہ ہے کہ ضروریات حیات سب پر مقدم ہیں۔ اوّل ان کی سربراہی ہونی چاہیئے اور وافر ہونی چاہیئے۔ ان کے بعد ضروریات کارکردگی ہیں۔ ان کا اہتمام کیا جائے اور خوب کیا جائے کہ یہ لازمۂ ترقی ہیں۔ ان کے بعد ضروریات راحت کی باری آتی ہے چونکہ کارکردگی کی ممد و معاون ہیں۔ لہذا ان کی فراہمی بھی ضرور ہے۔ ان سے مستفید ہونا گویا کارکردگی کی آبیاری کرنا ہے۔ البتہ ضروریات عیش سے جس قدر بھی احتراز کیا جائے کم ہے کہ یہ انحطاط کا پیش خیمہ ہیں اور بڑی بڑی حوصلہ مند قومیں عیش پرستی کی نذر ہو چکی ہیں۔

شادی غمی اور دیگر تقریبات کے تباہ کن مصارف جو رسم و رواج کی خاطر برداشت کئے جاتے ہیں، وہ بھی قابلِ ترمیم و تخفیف ہیں۔ قدیم کی طرح جدید طبقوں میں بھی تقریبات کا اسراف بڑھ رہا ہے۔ صرف شکل اور محل کا فرق ہے۔ جدید ترین مہذب تقریب کونسل اور اسمبلی وغیرہ کے میعادی انتخابات ہیں جن میں خلاف قاعدہ اور خلاف دیانت زیرباری کی حد تک زرپاشی کی جاتی ہے اور ضمیر فروشی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مالی زیرباری سے

بڑھکر اخلاق کی تضعیف و تخریب قابل توجہ ہے کہ اخلاق ہی معاشرت کا محافظ ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر معاشیات کے تحت معاشرت کی اصلاح و ترقی مقصود ہے تو ہر خاندان، ہر جماعت اور تمام ملک باقاعدہ ضروریات کی تنقیح کرے جب نوعیت ان کی تفریق کرے اور ان کی تکمیل میں لازماً یہ ترتیب قرار دے کہ حیات کارکردگی پر اور کارکردگی راحت پر اور راحت عیش پر مقدم رہے۔ جسم کی اصلاح و ترقی کے واسطے اچھی خوراک اور اچھی ورزش دماغ کی اصلاح و ترقی کے واسطے اچھی تعلیم اور دل کی اصلاح و ترقی کے واسطے اچھی تربیت اور ان ترقیات کی حفاظت کے واسطے اچھا ماحول اور اچھی صحبت۔ اگر یہ ہندوستان کا معاشی اور معاشرتی نظام العمل قرار دے دیا جائے تو پھر بھی ہندوستانی نوجوان کچھ سے کچھ ہو جائیں اور بڑے بڑے کام انجام پائیں۔

معاشی اور معاشرتی اصلاحات کی ترویج میں قانونی جبر کی گنجائش کم ہے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ تحریر و تقریر کے ذریعے اور ان سے بڑھکر عملی مثالوں کے ذریعے اصلاح کی تائید میں رائے عامہ پیدا کر کے اس کو اس قدر قوی اور موثر بنایا جائے کہ مخالفت اور مزاحمت خود ہی بے دم ہو جائے۔ اتفاق و اتحاد سب سے بڑی قوت ہے۔

غرض کہ ملک و ملت کی فلاح کے واسطے نہ پہلے کام کی کمی تھی اور نہ اب کمی ہے۔ بلکہ قومی ذمہ داریوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ مذہبی اوقاف، زکوٰۃ، خیر خیرات اور عام چندے۔ اگر ان کا باقاعدہ انتظام ہو جائے تو قومی کاموں کی راہ میں جو مالی رکاوٹ پیش آتی رہتی ہے وہ بڑی حد تک رفع ہو جائے اور اس کے ساتھ لازم ہے کہ قومی کاموں میں کفایت اور ایثار سے کام لیا جائے۔ امانت اور دیانت شرط مقدم قرار پائے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ایک قدیم ادارہ ہے، اور مسلم یونیورسٹی کا پرانا رفیق ہے۔ اگر خلوص و استقامت سے تنظیم کے تحت یہ ادارے اور ان جیسے دوسرے ادارے مل کر کام کریں تو کامیابی یقینی ہے۔ انشاء اللہ

حضرات! تقریب اور موقع کے لحاظ سے میرے نزدیک جو کچھ عرض کرنا ضرور تھا گرچہ میں نے بہت مختصر اور اجمالی طور پر عرض کیا، پھر بھی مجھے خوف ہے کہ میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ بالآخر ہم سب کی یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلوص و استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ خالق و مخلوق کے حقوق ادا کرائے اور حسن انجام دکھائے۔ واللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ والحمد للہ رب العالمین۔

خطبۂ صدارت

شیخ عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ علی گڑھ

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا، متعدد شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، ہر شعبہ کے صدر اور سکرٹری علیحدہ علیحدہ تھے۔

منجملہ ان شعبوں کے ایک "شعبۂ تعلیم نسواں" تھا جس کے صدر شیخ عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ علی گڑھ اور سکرٹری پروفیسر ہادی حسن صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور پروفیسر بشیر احمد صاحب ہاشمی (ٹریننگ کالج لاہور) تھے۔

شعبۂ تعلیم نسواں کا اجلاس ۲۶ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۸ بجے شب آسمان منزل میں منعقد ہوا، جس میں شیخ عبداللہ صاحب نے بحیثیت صدر حسب ذیل خطبہ پڑھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبہ صدارت شعبہ تعلیم نسواں

از

شیخ عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ علی گڑھ

حضرات! عام طور پر میں جلسوں کی صدارت سے بچنے کی کوشش کیا کرتا ہوں کیونکہ کسی مجلس میں صدر جلسہ پر جس قدر پابندیاں رہتی ہیں اس قدر دیگر حاضرین پر نہیں ہوتیں۔ اس مرتبہ دوستوں کی فرمائش کو ٹالنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اسی لئے آج اس جلسہ میں صدارت کی کرسی پر آپ مجھ کو دیکھتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ جلسہ کی کارروائی کے انجام دینے میں آپ حضرات میری مدد فرماویں گے۔

اس وقت آپ صاحبان جس جلسہ میں شرکت فرما رہے ہیں وہ شعبہ تعلیم نسواں کے متعلق ایک جلسہ ہے۔ یہ شعبہ تعلیم نسواں ۱۸۹۶ء میں قائم ہوا تھا۔ ۱۹۰۲ء سے قریب ۱۹۳۰ء تک میں اس کا سکرٹری رہا۔ اور بعد میں بوجوہات میں اس عہدہ کی ذمہ داری سے خود ہی علٰحدہ ہو گیا اور چند سال کے بعد جب دوستوں نے دیکھا کہ میں نے کام چھوڑ دیا تو کسی دوسرے صاحب کو سکرٹری مقرر کیا اور اب گذشتہ ۲ دو سال سے ہمارے مخدوم دوست پروفیسر ہادی حسن صاحب اور پروفیسر ہاشمی صاحب اس کے سکرٹری ہیں۔ مجملاً اس شعبہ کی یہی تاریخ ہے۔ اس کی تفصیل بہت طول ہے اس لئے اس کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

یہاں پر مجھے آپ کے سامنے کسی دقیق مسئلہ پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اصولی مسئلہ جو کچھ بھی لڑکیوں کی تعلیم سے تعلق رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہمارا مذہب لڑکیوں کی تعلیم کے موافق ہے یا مخالف ہے۔ مذہب کا حکم جو اس کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بیسیوں مرتبہ حاضرین کو سنایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا پاک مذہب ارشاد فرماتا ہے کہ ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر علم کا سیکھنا فرض ہے۔ اس ارشاد مبارک کے مقابل میں قرآن سے یا حدیث سے آج تک کسی نے ایک لفظ بھی پیش نہیں کیا جس سے معلوم ہو کہ اس ارشاد کے تسلیم کرنے میں مسلمانوں کو کسی قسم کے پس و پیش کی کوئی گنجائش ہے۔ ملکی قوانین نے تو زمانہ حال میں لڑکے اور لڑکیوں کی جبریہ تعلیم کے لئے قوانین وضع کئے ہیں۔ لیکن آج سے ۱۳۰۰ سال سے قبل ہی کسی وقت میں ہمارے مذہب نے لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لئے جبریہ اور لازمی تعلیم کا حکم دے دیا تھا۔ اس کے بعد آپ کے پاس کسی عُذر اور حجّت کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ دن رات اس فکر میں رہتے ہیں کہ اپنے لڑکوں کو تو آپ تعلیم دلائیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم سے صرف غفلت ہی نہیں کرتے بلکہ مخالفت بھی کرتے ہیں۔ اسلام کے بہت سے احکام اس وقت صرف کتابوں کے اندر دیکھے جاتے ہیں۔ عملی زندگی کے میدان میں ان احکام مبارک کو عموماً پس پشت ڈال کر فقط رسوم کی پابندی کی طرف توجہ رہتی ہے۔ مجھ کو جو قابل شکایت امر معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کے پاک اور حکیمانہ اصولوں کی خلاف ورزی بھی کیجادے اور پھر غریب مذہب کو دنیا بھر کے سامنے بدنام بھی کیا جاوے کہ ہمارا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ ہم لڑکیوں کو تعلیم دیں یا دلائیں۔

حضرات! میں نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے صرف کیا ہے۔ آیا مجھ کو اس میں کامیابی ہوئی یا نہیں۔ یہ ایک دوسرا امر ہے۔ لیکن میں اپنے دل میں پورے طور پر مطمئن ہوں کہ جو رستہ میں نے نوجوانی کی عمر میں اختیار کیا تھا اور جس پر میں اس وقت تک قائم ہوں وہ قطعی صحیح رستہ ہے۔ اور میں اس پر قائم رہنا چاہتا ہوں اور اپنے دوستوں کو مدعو کرتا ہوں کہ وہ بھی اس کی طرف آئیں اور آکر دیکھیں اور واقعات اور معاملات کو اپنے سامنے رکھ کر غور کریں کہ آیا وہ

صحیح رستہ ہے یا نہیں - اور آیا بغیر اُس کے اختیار کیے قوم منزل مقصود کو پہونچ سکتی ہے یا نہیں - میں اپنے معلومات کے لحاظ سے اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں کہ جو مسلمان اپنی ماں - اپنی بیٹی - اپنی بہن اور اپنی بیوی کی جہالت میں اپنے مذہبی اعتقاد کی مضبوطی سمجھتا ہو یا اپنی فلاح اور ترقی عورتوں کو جاہل رکھنے میں دیکھتا ہو وہ انجام کار سخت نقصان اوٹھانے والا انسان ثابت ہو گا - اور قوم کے لئے اس کا وجود سراسر مضرت اور تباہی کا باعث ہو گا -

صاحبو - میں نے اپنے طویل تجربے سے یہ معلوم کیا ہے کہ مسلمانوں کی قوم میں ایک بہت بڑا گروہ اس وقت بھی موجود ہے جو لڑکیوں کی تعلیم کا اُسی شدت سے مخالف ہے جس شدت سے کہ کوئی مسلمان کفر و الحاد کی باتوں کا مخالف ہوا کرتا ہے - مدرسہ نسوان علی گڑھ سے سیکڑوں لڑکیاں وقتاً فوقتاً تعلیم سے روکی گئیں اور بورڈنگ ہوس سے اٹھا لی گئیں جس کی وجہ دریافت سے یہ معلوم ہوئی کہ ان معصوموں کی تعلیمی ترقی کے رستہ میں حائل ہونے والی کوئی ایسی ہستی تھی جس کو لڑکی کے والدین اپنا مذہبی پیشوا سمجھتے تھے - مثلاً ایک مرتبہ ایک صاحب نے صاف صاف لکھا کہ جب ہمارے مولانا کو معلوم ہوا کہ میری لڑکی علی گڑھ کے مدرسہ میں پڑھتی ہے تو جناب موصوف کو رنج ہوا اور انہوں نے فرمایا کہ تم نے یہ کام ایک بڑی معصیت کا کام کیا ہے - میں اب لڑکی کو بورڈنگ ہوس میں نہیں رکھ سکتا - مہربانی سے اُس کو واپس بھیج دیجئے - ایک دوسرے صاحب نے ایک مرتبہ لکھا کہ یہاں پر ہمارے خاندانی پیر صاحب آئے تھے - خاندان والے تو پہلے ہی سے لڑکی کے علی گڑھ بھیجنے کے مخالف تھے اب پیر صاحب نے آکر اُن کی رائے اور مضبوط کر دی - لڑکی کو اب واپس بھیج دیجئے - اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں قابل ذکر ہیں لیکن طوالت کی وجہ سے ان سب کا پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا -

مجھے علی گڑھ کے مدرسہ کے علاوہ اپنے صوبہ کے دیگر مقامی حالات کے دریافت کرنے کی بھی جستجو رہتی ہے اِن میں سے چند باتیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے کسی شخص کو یہ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی کہ مسلمان تو تعلیم نسوان کے مخالف نہیں

ہیں ان کو یوں ہی بدنام کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی مثال میں کانپور کے ایک مدرسہ کی پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ کانپور کی میونسپلٹی نے ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول ایک عرصہ سے قائم کر رکھا ہے اور اس میں چارسو سے زیادہ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ ان ۴۰۰ میں ایک بھی مسلمان لڑکی نہیں تھی۔ حالانکہ یہ مدرسہ اسی روپئے سے چلتا ہے جس میں مسلمانوں کا بھی کافی روپیہ شامل ہے اور تعلیم کی یا پردہ کی سواری کی کوئی فیس بھی نہیں لیتا۔ جب دیکھا گیا کہ اس مدرسہ میں مسلمان لڑکیاں داخل نہیں ہوتی ہیں تو ہندو ممبروں نے مسلمان ممبروں سے کہا کہ آپ لوگوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ مسلمان لڑکیاں بھی آکر پڑھیں۔ تو مسلمانوں نے یہ عذر پیش کیا کہ چونکہ اس مدرسہ میں کوئی مسلمان استانی نہیں ہے اس لئے مسلمان لڑکیاں اس میں داخل نہیں ہوتیں چنانچہ ہندو ممبروں نے اس حجت کے رفع کرنے کو علی گڑھ کی ایک گریجویٹ مسلمان لڑکی کو اپنے ہاں جگہ دی اور پھر مسلمانوں سے کہا کہ اب تم کوشش کر کے مسلمان لڑکیوں کو بھرتی کراؤ۔ چنانچہ ایک مسلمان ممبر صاحب نے کوشش کر کے دو لڑکیوں کو بھرتی کرایا۔ جب ان لڑکیوں کے مدرسہ میں داخل ہونے کی خبر شہر میں پہونچی تو مسلمانوں میں ایک شورش پیدا ہو گئی کہ غضب ہو گیا کہ ہماری لڑکیاں انگریزی مدرسہ میں داخل ہونے لگیں۔ شریر لڑکوں کو بھیجا گیا کہ وہ مدرسہ کے چاروں طرف کھڑے ہو جاویں اور ان لڑکیوں کا جب تانگہ مدرسہ میں پہونچے تو ہوحق کریں آوازے کسیں پکٹنگ کریں اور اسی کے ساتھ لڑکیوں کے والدین کے پاس ڈیپوٹیشن گیا کہ ہم تم کو اور تمہاری لڑکیوں کو سخت بدنام کریں گے۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ تم لڑکیوں کو اوٹھالو۔ چنانچہ وہ لڑکیاں مدرسہ سے اٹھالی گئیں۔ اور اس کے بعد میونسپلٹی کا جب انتخاب ہوا تو ان ممبر صاحب کی جنھوں نے لڑکیوں کو بھرتی کرایا تھا مخالفت کی گئی اور مخالفت کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہ شخص اسلام کا مخالف ہے لڑکیوں کو انگریزی مدرسوں میں پڑھواتا ہے۔

اسی کانپور شہر میں ایک اور اردو کا مدرسہ تھا وہاں کی لڑکیوں کے خلاف ایک لوکل اخبار نے نہایت فحش مضامین لکھے اور ایڈیٹر پر ہتک عزت کا مقدمہ قائم ہوا۔ اور چار مہینہ کی قید اور جرمانہ کی سزا ملی۔ اسی طور پر علی گڑھ کے پردہ کے مسلم گرلز کالج کے

خلاف نہایت ظالمانہ اور ہتک آمیز جھوٹے مضامین لکھے گئے ایڈیٹر صاحب کو ۱۶ ماہ کی قید اور ۵۰۰ روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ عدالت العالیہ ہائی کورٹ نے اس مقدمہ میں جو فیصلہ صادر فرمایا ہے اس کے پڑھنے سے آپ کو پورے طور پر پتہ چل سکتا ہے کہ مضامین لکھنے والے نے معصوم مسلمان لڑکیوں کو بلاکسی وجہ کے کس قدر بدنام کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ایک پردہ کے مدرسہ میں بھی مسلماں لڑکیاں تعلیم نہ پاسکیں۔

مرادآباد کی میونسپلٹی میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے شہر کے کسی محلہ میں جبریہ تعلیم کا قانون جاری کیا جاوے تو مسلمان ممبروں نے اس کی نہایت سخت مخالفت کی کہ ہماری لڑکیوں کو جبراً تعلیم دلانا یہ ہمارے مذہب میں ایک مداخلت ہوگی۔ تجویز جو ہندوؤں کی طرف سے پیش ہوئی تھی وہ نامنظور ہوئی اور اس پر ایک ہندو اخبار نے لکھا کہ مسلمان نہ آپ خود کچھ کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ جہاں کہیں آگے سرکنے کا موقع ملتا ہے وہیں مسلمان اڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ہم یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔ واضح رہے کہ یہ جبریہ تعلیم صرف ابتدائی تعلیم ہے جو ۹ سال کی عمر میں یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ سال کی عمر میں ختم ہوجاتی ہے۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اس عمر کی مسلمان لڑکیوں کو مفت اور جبریہ تعلیم دلانے کی جو قوم مخالف ہو وہ زمانہ حال کے اور کس ترقی کے وسیلہ کی مخالف نہ ہوگی۔ ترکوں میں تو کل قوم کو لڑکے اور لڑکیاں جبریہ تعلیم کے لئے مجبور کئے گئے ہیں لیکن یہاں ہمارے ملک میں ۹ سال کی لڑکیوں کو بھی تعلیم دلانا ہمارے اہل وطن کو ناگوار ہے۔

پارسال ہمارے مدرسے کی لڑکیوں نے خود ارادہ کیا کہ ہم تعطیلات میں جب اپنے گھر جائیں گے تو اپنے اپنے وطن سے اپنی غریب بہنوں کے وظائف فنڈ کے لئے چندہ جمع کر کے لائیں گے بریلی کی ایک لڑکی بھی چندے کی کتاب لے گئی اور ایک صاحب نے اس کو دو روپئے دیئے انہوں نے اس چندے کا ذکر کسی مولوی صاحب سے کیا کہ علی گڑھ کے مدرسے کی لڑکی چندہ مانگ رہی ہے۔ میں نے دو روپئے دئے ہیں۔ مولوی صاحب نے بلا تامل فرمایا کہ لڑکیوں کے مدرسے کے لئے چندہ دینا حرام ہے تم نے یہ عذاب اپنے اوپر کیوں لیا۔ وہ صاحب بھاگے ہوئے لڑکی کے پاس آئے اور مولوی صاحب کے فتوے کا ذکر کر کے نہایت

اصرار کر کے وہ روپیئے واپس لے گئے۔

یہ چند واقعات مختصراً آپ کے سامنے اس لئے پیش کئے گئے ہیں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ہندوستان کے مسلمان تعلیم نسوان کے متعلق کیسے ذلیل اور ناقص خیالات رکھتے ہیں۔ یہ اسی ضد اور کورانہ خیال کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانوں کی عورتیں بجائے اس کے کہ سب کی سب بموجب حکم شریعت تعلیم یافتہ ہوتیں ان میں ہر ہزار عورتوں میں صرف ۲ تعلیم یافتہ عورتیں ہیں۔ اور باقی ۹۹۸ عورتیں جاہل مطلق رہنے پر مجبور کی گئی ہیں۔ اس کا انصاف میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آیا احکام شریعت کی خلاف ورزی کرنے والی وہ جماعت ہے جو تعلیم نسوان کی حامی ہے یا وہ فرقہ ہے جو تعلیم نسوان کا مخالف ہے۔ تجربہ سے فائدہ اٹھانا انسان کی عقل کا ایک معمولی تقاضا ہے۔ لیکن مسلمان اپنی رسم پرستی کے مقابل میں عقل سے کبھی کام نہیں لیتے۔ تجربہ ان کو صاف بتا رہا ہے کہ عورتوں کو جاہل اور ذلیل رکھ کر کسی قوم نے فلاح حاصل نہیں کی۔ ترکوں کی نہایت زبردست مثال ہمارے سامنے ہے کہ انہوں نے بھی بہت عرصہ تک عورتوں کو ذلیل اور جاہل رکھا۔ اور ان کی اس طرز زندگی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خود بھی ذلت کی پستی تک گرتے ہی چلے گئے۔ اور دنیا نے ان کو بیمار آدمی کا خطاب دیدیا اور چاروں طرف اس تاک میں بیٹھ گئے کہ کس وقت اس بیمار کا دم نکلے کہ ہم اس کا ملک و مال آپس میں تقسیم کر لیں۔ آخر کار اس قوم میں ایک مرد میدان پیدا ہوا اور اس نے کل قوم کی آنکھیں کھولدیں کہ تمہاری ذلت اور تباہی کا باعث غیر ملک کے حملہ آور نہیں ہیں بلکہ تمہاری غفلت اور ناعاقبت اندیشی ہے کہ تم اپنی عورتوں کو جاہل اور ذلیل رکھتے ہو۔ ترکوں کے دلوں میں اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے عورتوں کو پوری آزادی دے دی اور مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے تعلیم لازمی کر دی۔ آج اُس کا نتیجہ خود دیکھ لیجئے کہ وہی بیمار جو بستر مرگ پر پڑا پڑا دو صدیوں تک دم توڑتا رہا آج پھر اس کے دم میں دم آگیا اور نہایت تنومند معزز و محترم انسان کی صورت میں دنیا کے سامنے کھڑا ہے کسی کی مجال نہیں کہ آنکھ اٹھا کر اس کے ملک و مال کی طرف دیکھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ترکوں کی مثال تو بہت بڑی مثال ہے وہ

ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ہموطن ہندوؤں کی مثال سے بھی فائدہ اٹھانے کی قابلیت نہیں ہے۔ آج سے ۶۰ سال قبل انہوں نے واویلا کرنا شروع کیا تھا کہ ہندو ہم سے آگے بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ وہ دولت میں ہم سے آگے ہو گئے۔ علم و ہنر میں ہم سے آگے ہو گئے۔ قومی احساس میں ہم سے آگے ہو گئے۔ غرض کہ ہر چیز میں ان کے آگے بڑھ جانے کی شکایت رہی۔ اور اپنے لئے پیچھے رہ جانے کا افسوس رہا لیکن جو کام ہندو کر رہے ہیں اُن میں سے مسلمانوں نے ایک کام بھی اختیار نہ کیا۔ سب سے اوّل انگریزی تعلیم ہی کی مخالفت کی کہ لڑکوں کو بھی تعلیم نہیں دینی چاہیئے۔ اس کے بعد زمانہ حال کی تجارت کی مخالفت کی کہ یہ سراسر سود ہی سود ہے۔ پھر جب لڑکیوں کی تعلیم کا چرچا شروع ہوا تو ہندوؤں نے اور سکھوں نے اور آریہ سماجیوں نے لڑکیوں کے لئے مدارس اور ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالج اور ڈگری کالج قائم کرنے شروع کئے اور گذشتہ ۲۰ سال کے زمانہ میں سینکڑوں درس گاہیں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے قائم ہو گئیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا اب تک وہی رویہ ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میری سمجھ میں مسلمانوں کی ذہنیت کے بارے میں کوئی بات اس وقت تک نہیں آئی کہ وہ دُنیا میں کیا چاہتے ہیں کہ کیا ہو جائیں اور کس طرح ہو جائیں۔ ذرائع اور اسباب ترقی کو نہ خود کام میں لاتے ہیں۔ اور جب کوئی دوسرا ذرائع اور اسباب مُہیّا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی مخالفت کرتے ہیں تو پھر وہی خود بتائیں کہ وہ اس زمانہ کے کشمکش کے میدان میں کیسے بازی جیت سکتے ہیں۔

صاحبو۔ میں نے اپنی عمر میں مسلمانوں کی زبان سے ہمیشہ اس بات کی شکایت سُنی ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے بدشوق۔ آوارہ۔ بدمزاج ناعاقبت اندیش اور غبی الذہن ہوتے ہیں اور اب تو اس بات کا پورا ثبوت بھی ہم پہونچ گیا ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے بلحاظ اپنی ذہنیت اور دماغ کے ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو خدا نے دماغ نہیں دیا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے دماغ سے کام نہیں لیتے اور دماغ سے کام لینے کے لئے ان کو ابتدا سے رہنمائی نہیں کی جاتی۔ اس بات

کی شکایت بالکل بیجا ہے کہ ہمارے لڑکوں کو مقابلہ کے امتحانات میں وہ آسانیاں نہیں ملتی ہیں جو دوسروں کو ملتی ہیں۔ اب ہمارے سامنے اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اگر اپنے ذہن سے کام لینے والا اور اپنے دماغ کو پورے طور پر کام میں لانے والا کوئی مسلمان لڑکا ہوا ہے تو وہ سب سے اول نمبر پر دکھائی دیتا ہے۔ پس خارجی اسباب کی شکایتیں کرنا اور خود اپنے بچوں کو مقابلہ کے لئے پورے طور پر تیار نہ کرنا اس میں مسلمانوں کا خود قصور ہے اور اس کے لئے کوئی دوسرا شخص ذمہ دار نہیں ہے۔ اپنے بچوں کو تیار کرنے کے لئے کوئی دنیا میں دوسرا ذریعہ نہیں دکھائی دیتا اور اگر ذریعہ ہے تو وہ اوایل عمری کی تربیت ہے۔ اور وہ تربیت فقط ایک تعلیم یافتہ روشن دماغ ماں ہی کی گود میں ہو سکتی ہے۔ جاہل ماں اپنے بچہ کے گلے میں یا اس کے بازو پر تعویذ باندھ کر اور رعاملوں سے جھاڑ و پھونک کرا کرا کے نہایت ہی وہمی طبیعت کا انسان بنا دیتی ہیں۔ ایسے بچوں سے ہم کو مطلق کوئی امید نہیں ہو سکتی کہ وہ بڑے ہو کر مرد میدان بنیں گے اور جد و جہد کے میدان میں آکر بازی جیتیں گے۔ مسلمان اپنے پاؤں میں خود کلہاڑی مار رہے ہیں۔ وہ ہر امر میں بہت ادنیٰ حالت کو پہونچ گئے ہیں۔ لیکن اب بھی ان کو عقل نہیں آئی ہے کہ وہ اپنی دیرینہ رسموں اور پرانے خیالات کو ترک کر کے عہد جدید کے میدان میں آئیں اور اپنے چاروں طرف دیکھ کر آگے بڑھنے کی کوئی صورت نکالیں۔

صاحبو۔ میں نے غیر ممالک میں سے صرف ترکوں کی مثال آپ کے سامنے پیش کی ہے لیکن اگر آپ غور کریں گے تو یورپ کی کل اقوام امریکہ۔ جاپان اور برطانیہ کلاں کی نوآبادیاں یہ سب آپ کے سامنے مثالیں اور نمونے پیش کر رہے ہیں کہ یہ بھی کسی زمانہ میں نہایت ادنیٰ حالت میں تھے اور وہ زمانہ ان کے لئے وہ تھا جب وہ عورتوں کو جاہل رکھا کرتے تھے۔ لیکن بہت عرصہ ہوا کہ انہوں نے عورتوں کی جہالت میں اپنی بہتری اور برتری کے ناپاک خیال کو ترک کر دیا اور اس وقت سے اُن کی قومی ترقی کا آغاز ہوا۔ اور اب آج یہی قومیں سپہر اقبال پر آفتاب کی طرح چمک رہی ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت ہر ساں ہندو۔ عیسائی۔ پارسی۔ سکھہ۔ لڑکیاں

سینکڑوں کی تعداد میں بی اے اور ایم اے اور ڈاکٹری کے امتحانات پاس کرتی ہیں اور ملک میں اس طریقہ سے روشنی پھیلانے میں مدد دے رہی ہیں جس طور پر کہ یورپ میں اور ٹرکی میں اور جاپان میں عورتوں نے تعلیم پاکر روشنی پھیلائی ہے۔ اس میں ایک بات آپ کے لئے قابل افسوس یہ بھی ہوگی کہ ہماری ہموطن اقوام کی تعلیم یافتہ لڑکیاں جو کام اس وقت کر رہی ہیں اس کا دائرہ ان کی اپنی اپنی قوم تک محدود ہے اور مسلمان اس دائرہ سے بالکل باہر ہیں۔ کیونکہ جب وہ تعلیم یافتہ لڑکیوں پر بہتان اوڑاتے ہیں ان کی عزت نہیں کرتے تو پھر ان کے کاموں کی طرف وہ کیسے متوجہ ہو سکتے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اچھوتوں کی طرح دور ہی رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو ان کے اثر سے بچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مسلمان لڑکیاں جنھوں نے اس وقت تک بی اے پاس کیا اون کی تعداد جہاں تک مجھ کو معلوم ہوا ہے کم و بیش پچاس ساٹھ ہوگی اور ان پچاس ساٹھ میں ۳۰ لڑکیاں وہ ہیں جنھوں نے مسلم گرلس کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی اور ان کو شوق دلایا گیا کہ وہ آگے تعلیم حاصل کریں۔ ان میں سے اکثروں کے والدین کی خوشامد کی گئی کہ وہ اپنی لڑکی کو لکھنؤ یا لاہور یا الہ آباد کے کالج میں بھیج کر بی اے پاس کرائیں۔ اگر یہاں کی تعلیم یافتہ سب لڑکیاں دوسرے کالجوں میں جاکر تعلیم پاسکیتں تو اس وقت مسلمان گریجویٹ لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی لیکن سب مسلمان اپنی لڑکیوں کو دوسرے کالجوں میں داخل نہیں کر سکتے۔ اوّل تو اکثر خاندانوں کی طرف سے یہ حجت پیش ہوتی ہے کہ اُن کالجوں میں پردہ کا انتظام نہیں اس لئے ہم اپنی لڑکی کو ان میں داخل نہیں کرا سکتے۔ اور دوسری اور اصلی وجہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری ہے کہ وہ اُن کالجوں کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ اُن کالجوں کے خرچ اور مسلم گرلس کالج علی گڑھ کے اخراجات میں بہت بڑا فرق ہے۔ ان کالجوں میں بہ نسبت اس کالج کے قریباً دوچند خرچ پڑتا ہے۔ بکثرت مسلمان لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کو موقع نہیں ملتا۔ مسلم گرلز کالج ۳ سال سے اس بات کی فکر میں ہے کہ کسی طرح سے بی اے کلاس کھولے لیکن ابھی تک یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کلاس کُھلے گی یا نہیں۔ مسلمان

اس کے لئے روپیہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ گورنمنٹ نے بھی سر دست عذر کر دیا ہے کہ ہمارے پاس فنڈ نہیں ہے۔ یونیورسٹی کی طرف سے پانچ ہزار روپیہ اس کلاس کے لئے تجویز ہوا ہے۔ لیکن ڈگری کالج پانچ ہزار روپیہ سے نہیں کھل سکتا۔ یہ ایک انصاف کی بات تھی کہ نو دس لاکھ روپیہ جو لڑکوں کی تعلیم پر یونیورسٹی خرچ کر رہی ہے ان میں سے کم از کم دو فیصدی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا جاتا لیکن اس وقت تک اس اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ کوشش جاری ہے۔ دنیا بہ امید قائم ہے۔

اس سال ۲۰ لڑکیاں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں مسلم گرلس کالج سے شریک ہو رہی ہیں اور ۲۸ لڑکیاں میٹرک کے امتحان میں بیٹھیں گی اور بہت سی لڑکیاں پہلے سے انتظار میں بیٹھی ہیں کہ کب ڈگری کالج کھلے اور کب ہم داخل ہوں لیکن ڈگری کالج کے کھلنے کے جو کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں وہ آپ کے سامنے پیش کر دیے گئے ہیں۔

دوسری ضرورت جو اس وقت علی گڑھ گرلز کالج کو ہے وہ سائنس کلاس کے کھلنے کی ہے۔ ہماری لڑکیاں ڈاکٹری کے کلاس میں اس وقت تک شریک نہیں ہو سکتیں جب تک وہ انٹرمیڈیٹ میں سائنس کے مضمون میں امتحان پاس نہ کریں۔ گرلز کالج نے اس وقت تک سخت کوشش کر کے ۸ لڑکیوں کو ڈاکٹری کے امتحانات پاس کرائی ہیں۔ اور چار پانچ لڑکیاں ابھی تک پڑھ رہی ہیں۔ سائنس کلاس کے نہ ہونے کی وجہ سے ان لڑکیوں کو لیڈی ہارڈنگ کالج میں بجائے ۵ سال کے ۷ و ۷ سال تک پڑھنا پڑا اور لیڈی ہارڈنگ کالج کے اخراجات بہت زیادہ ہیں سب لڑکیاں برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس کانفرنس کو اس بارے میں گرلز کالج کی مدد کرنی چاہئے۔ ایک تو گرلز کالج میں سائنس کلاس کھلوانے کے لئے فنڈ جمع کرنا چاہئے اور دوسرے لیڈی ہارڈنگ کالج میں تعلیم پانے کے لئے کچھ وظائف مقرر کرنے چاہئیں۔ میں گذشتہ ۳۰ سال سے عرض معروض کرتا رہا ہوں کہ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف کانفرنس کو خاص توجہ کرنی چاہیے۔ آج میں ایک خاص کام کے لئے اس کانفرنس کی توجہ کی خواہش کرتا ہوں کہ یہ کام کانفرنس کو فوری اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ ہندوستان میں نصف آبادی عورتوں

کی ہے اور نصف مردوں کی ہے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ عورتوں کو طبّی امداد کی مردوں کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ضرورت ہے اور یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ عورت ڈاکٹر ہی عورت مریض کا اچھا علاج کر سکتی ہے۔ پس ہم کو بہت سی ڈاکٹر عورتیں تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس وقت ۵۰۰ روپیہ مہینہ کی آمدنی ہمارے پاس ہو تو ہم سائنس کی کلاس کھول سکتے ہیں اور کچھ وظائف بھی مقرر کر سکتے ہیں۔ یہ ۵۰۰ روپیہ مہینہ کے لئے اپیل کوئی بڑی اپیل نہیں ہے۔ میرا کام اپیل کرنے کا اور درخواستیں پیش کرنے کا ہی نہیں ہے بلکہ عملاً جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکتا ہے وہ خدمت میں انجام دے رہا ہوں جو آپ کے سامنے ہے۔ اور اگر آپ کوئی فنڈ اس گرلز کالج کے لئے جمع کریں گے تو آپ کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ اس کا بہترین صرف ہوگا اور ایک پیسہ بھی بیجا طور پر خرچ نہ ہوگا۔

اپنی تقریر کے ختم کرنے سے قبل آپ کی توجہ ایک خاص امر کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوستانی زبان میں ایک مثل مشہور ہے کہ بلا دولھا کے یہ برات کیسی۔ یعنی جس کے لئے اور جس کی وجہ سے سب لوگ جمع ہوئے ہوں اگر وہی اس محفل میں نہ ہو تو پھر برات کے جمع کرنے سے کیا فائدہ۔ آپ مسلمانوں کے موجودہ نظام سوسائٹی کا نقشہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیجئے۔ عورتوں کی تعلیم کے متعلق ایک جلسہ کیا گیا ہے۔ مجھکو حکم دیا گیا کہ میں کرسی صدارت سے آپ کی خدمت میں اپنے خیالات پیش کروں۔ پروگرام میں شعبے کا جلسہ درج ہوا۔ بہت سے احباب نے جلسے میں شرکت فرمائی۔ لیکن جن کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہے اُن کو نہ یہاں آنے کی اجازت اور نہ ان کے آنے یا بیٹھنے یا سُننے کے کسی موقع کا کوئی انتظام کیا گیا۔ اس میں منتظمین کا قصور ہو یا نہ ہو۔ لیکن ہماری سوسائٹی سراسر قصوروار ہے۔ ہماری سوسائٹی کے خیالات اس بارے میں بہت ہی فرسودہ ہیں۔ وہ عورت میں کوئی خوبی نہیں دیکھتے اور اگر ان کے نزدیک کوئی خوبی ہے تو فقط یہ کہ وہ اپنا منہ دنیا سے چھپائے کسی تاریک کونے میں بیٹھی بیٹھی اپنی زندگی ختم کردے۔ دنیا میں کوئی قوم ان حالات میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا

سکتی۔ تمام ترقی کرنے والی قوموں نے ابتدا سے لے کر آج تک عورت کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیا ہے۔ وحشی قومیں تو عورتوں کو جنگلوں میں ہر وقت ساتھ رکھتی تھیں اور بڑھتے بڑھتے ان میں سے بہت سی مہذب ہو گئیں۔ اہل یورپ نے ابتدا سے لے کر آج تک عورتوں کو کسی میدان سے بھی الگ نہیں رکھا۔ گو ابتدا میں ان کے ساتھ سلوک اچھا نہیں تھا لیکن اُس کو ہر وقت اور ہر معاملے میں اپنے ساتھ رکھا۔ عرب اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد ہر کام میں عورتوں کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اسلام کے بعض جنگی معرکوں میں عورتوں نے اس قسم کی مدد دی تھی جیسی کہ جنگ عظیم میں یورپ میں عورتوں نے مدد دی تھی اور جیسے کہ ترکوں نے اپنی آزادی کی اخیر جنگ میں عورتوں سے مدد لی تھی۔

لیکن صاحبو۔ ہندوستان کا خدا ہی کچھ نرالا ہے۔ یہ مثل بھی ہندوستانیوں پر ہی صادق آتی ہے گو خدا دو نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں لیکن یہاں کے مسلمانوں کے ذہن میں جس خدا کی ہستی کا خیال ہے وہ ہستی دوسری قوموں کے خدا سے کچھ الگ اور نرالی ہی ہستی معلوم ہوتی ہے۔

اب دو دو باتیں غیر ممالک کے مسلمانوں کی بابت اور سُن لیجئے۔

کتاب روتھ فرانسس وڈز وال

RUTH FRANCIS' WOODSWALL

Muslim Women enter a New World

BOOK 425 PAGES

بہت سے لوگوں۔ عورتوں اور مردوں سے سوال

Are there any changes with regard to women ?

Ans. "Yes, undoubtedly—great changes," is the unmistaken reply.

Today we have Schools for girls and every one believes that girls as well as boys should have an education.

Opinion of the Sheikh of Baghdad :

"People misinterpret Quran in allowing girls to receive education." That his two daughters were students in the secondary Schools and his third daughter was a boarder in a school.

اخبار طہران مورخہ ۱۰ ر فروری ۱۹۳۶ء اعداد و شمار

تعداد طالبات

سنہ ۱۹۱۰ء میں	۲۱۶۷	ایران کی کل آبادی
سنہ ۱۹۲۹ء "	۱۱۴۸۹	ایک کروڑ سے سوا کروڑ
سنہ ۱۹۳۳ء "	۵۰۰۰۰	بیان کی جاتی ہے

مصر

سنہ ۱۹۲۳ء میں	۱۵۰۸۰۶۰	آبادی ڈیڑھ کروڑ
سنہ ۱۹۲۸ء "	۱۹۹۶۴۷۰	
سنہ ۱۹۳۲ء "	۲۶۹۶۴۷۰	

ترکی میں تو اب ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے لئے تعلیم لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر آبادی ہے اتنے ہی تعلیم یافتہ ہونگے۔

ہندوستان کی عورتیں سب سے زیادہ جہالت میں مبتلا ہیں۔ ہندو بہت ترقی کر رہے ہیں۔ ہندو بچوں کی نسبت مسلمان بچوں میں اموات زیادہ ہیں۔ ہندو عورتوں کی نسبت مسلمان عورتوں کی صحت بھی خراب ہے۔ کمزور بھی زیادہ ہیں مسلمان عورتیں ہندو عورتوں کی نسبت زیادہ مالیخولیا اور خفقان کی بیماریوں میں مبتلا پائی جاتی ہیں۔

صاحبو۔ اب میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ بہت سی باتیں میں نے آپ سے ایسی کہیں ہیں جن کو آپ خود بھی جانتے ہوں گے۔ لیکن اب اس زمانہ میں جاننے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اب سوال ہے کام کرنے کا اور عمل کا۔ محض علم سے دنیا میں کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔ علم کے ساتھ عمل لازمی ہے۔ مسلمان مسلمہ طور پر عمل کے میدان میں کمزور ہیں۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اگر وہ ہمّت کر کے کھڑے ہو جاویں اور خلوص اور ایثار سے ایک ایک کام اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو

پورا کرنے کی کوشش کریں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ سب کچھ کہنے کے بعد خدا سے دعا مانگے کہ خدا ہم کو کام کرنے کی توفیق دے۔ میں بھی اس دعاء پر اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

خطبۂ صدارت

(خانصاحب) سیّد آل علی نقوی صاحب

انسپکٹر مدارس اسلامیہ صوبۂ متحدہ

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا، وہ متعدد شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، ہر شعبہ کے صدر اور سکریٹری علیحدہ علیحدہ تھے۔

منجملہ ان شعبوں کے ایک "شعبہ ابتدائی تعلیم و مدارسِ اردو" تھا جس کے صدر، خان صاحب سید آلِ علی صاحب نقوی ایم اے (انسپکٹر مدارس اسلامیہ صوبجات متحدہ)، اور سکریٹری سید اسد اللہ صاحب کاظمی اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس میرٹھ تھے۔

اس شعبہ کا اجلاس ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۸ بجے صبح مشتاق منزل میں منعقد ہوا جس میں نقوی صاحب نے حسب ذیل خطبہ پڑھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ صدارت شعبۂ ابتدائی تعلیم و مدارس اُردو

از

(خانصاحب) سید آل علی نقوی صاحب انسپکٹر مدارس اسلامیہ صوبہ متحدہ

معزز خواتین و حضرات! آپ نے اس شعبہ کا صدر منتخب کرکے میری جو عزت افزائی فرمائی ہے میں اُس کا نہایت صدق دلی اور خلوص سے شکر گزار ہوں۔ مجھ کو پورے طور پر احساس ہے کہ اس اجلاس کی رہنمائی کے واسطے مجھ سے زیادہ تجربہ کار اور مستند ماہر تعلیم کا انتخاب کیا جانا ضروری تھا۔ لیکن موجودہ صورت میں معرکۂ تعلیم کے ایک ادنیٰ سپاہی اور کانفرنس کے دیرینہ خادم کی حیثیت سے بزرگان قوم کے اس محبت آمیز حکم کو بلاچون و چرا تسلیم کرنا مجھ پر واجب ہی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاءاللہ میں اپنے فرض کو اپنی بساط کے مطابق ادا کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ امید ہے کہ آپ حضرات اپنی کریم النفسی سے میرے خیالات پریشان کو توجہ سے سُنیں گے اور اس جلسہ کو کامیاب بنانے میں میری معاونت فرمائیں گے۔

اس مرتبہ آل انڈیا مسلم تعلیمی کانفرنس میں ابتدائی تعلیم کا علٰحدہ شعبہ قائم ہونا ایک فال نیک ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اس بڑے قومی ادارہ کے اراکین نے بالآخر جمہوری تعلیم کو (جس پر حقیقتہً جملہ قومی ترقیات کا انحصار ہے) مناسب اہمیت دی ہی

اور بچوں کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی طور پر بحث وتمحیص کرنا ضروری خیال کیا۔ مجھ کو توقع ہے کہ بزرگان کانفرنس آیندہ نہ صرف یہ کہ اس شعبہ کو قائم ہی رکھیں گے بلکہ یہاں جو امور پیش ہوکر غور وبحث کے بعد طے ہوں گے اُن کو عملی شکل دینے کی مستقل اور منضبط کوششیں بھی جاری رکھیں گے۔ اگر ایسا کیا گیا تو مجھ کو یقین ہے کہ اس کانفرنس کے ذریعہ سے جو مفید و مستحسن نتائج اب تک قوم و ملک کو حاصل ہوئے ہیں اُن میں انشاء اللہ روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔

حضرات! زمانۂ حاضرہ میں جبکہ عام ابتدائی تعلیم کا ناگزیر ہونا عالمگیر طور پر تسلیم ہوچکا ہے بلکہ متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں تقریباً تمام باشندگان ملک خواندہ ہوچکے ہیں اس کی ضرورت ثابت کرنے کے واسطے دلائل پیش کرنا عبث ہے۔ تاہم چونکہ ہمارا وطن عزیز خواندوں کی تعداد کے لحاظ سے اس وقت تک صف آخر میں ہے سرسری طور پر یہ ذکر کردینا نامناسب نہ ہوگا کہ ہماری تمدنی، معاشرتی، اقتصادی نیز ملکی ضروریات اس کی مقتضی ہیں کہ ہندوستان سے جلد از جلد جہالت اور ناخواندگی کی لعنت کو دور کیا جائے۔ اہل ہند کی جہالت کا اثر اس زمانہ میں تمام پیشوں پر پڑ رہا ہے چنانچہ زراعتی کمیشن اور بنکوں کی تحقیقات کے کمیشنوں نے اپنی رپورٹوں میں اس پر زور دیا تھا کہ ملک کی حالت بہتر کرنے کے لیے سوام الناس کو خواندہ بنانا ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اصلاح دیہات کی تحریک مؤثر، دیرپا اور مستقل طور پر مفید اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ کم از کم ابتدائی تعلیم ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائے۔ اس کے علاوہ مقامی بورڈوں اور کونسلوں کے انتخاب میں بھی رائے دہندگان خواندہ ہونے کی صورت میں ہی اپنی رائے کا صحیح استعمال کرسکتے ہیں۔ اس جمہوریت کے زمانہ میں جبکہ حکومت خود اختیاری اور نمایندہ جماعتوں کی کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے کہ ہر رائے دہندہ بلکہ ہر باشندۂ ملک ملکی معاملات سے باخبر رہے بدقسمتی سے ہندوستان کے نوّے فی صدی اشخاص ناخواندہ ہونے کی وجہ سے اس کی استعداد اور اہلیت ہی نہیں رکھتے کہ وہ ملکی انتظامات ومعاملات کو سمجھ کر صحیح رائے قائم کرسکیں۔ جہاں تک کہ مسلمانوں کا تعلق ہے عام تعلیم کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے۔

علاوہ مذکورۂ بالا حالات اور وجوہ کے جو اُن کے اور دیگر اقوام کے درمیان مشترک ہیں مسلمانوں کو اپنے مذہب اور مخصوص تمدن و تاریخ سے واقف ہونا بھی ان کی انفرادی حیثیت قائم رکھنے۔ قومی زندگی کو مضبوط اور آیندہ ترقیات کو متیقن کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔

مزید کچھ عرض کرنے سے قبل موجودہ نظام ابتدائی تعلیم کی تدریجی ترقی کا مختصر تذکرہ خلاف محل نہ ہوگا۔ گذشتہ زمانوں میں ابتدائی تعلیم گو مکاتب اور پاٹھ شالوں کے ذریعہ سے عام طور پر دی جاتی تھی لیکن اس کو کسی خاص قومی یا ملکی نظام کے تحت میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ گورنمنٹ انگریزی کے ہندوستان میں قائم ہونے کے بعد ۱۸۵۴ء میں اول مرتبہ باقاعدہ طور پر نظام تعلیم منظور ہوا جس میں ورنیکولر ثانوی و ابتدائی تعلیم پر بھی توجہ دی گئی۔ بعد ازاں مراسلہ ۱۸۵۹ء میں ۱۸۵۴ء کی پالیسی کی تائید کی گئی اور ابتدائی تعلیم کی ترقی پر زور دیا گیا۔ ۱۸۷۱ء میں سررشتۂ تعلیم کی نگرانی لوکل گورنمنٹوں کو تفویض کی گئی اور ان کو کچھ رقوم مرکزی گورنمنٹ سے بطور امداد دی گئیں۔ ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن مقرر ہوا جس نے ابتدائی تعلیم کے متعلق خاص طور پر تحقیقات کی۔ ۱۸۸۴ء میں ایک گورنمنٹ رزولیوشن میں کمیشن مذکور کی تقریباً جملہ سفارشات کی بالعموم اور عام طبقوں کی ابتدائی تعلیم کی توسیع و اصلاح کی تجاویز کی خاص طور پر تائید کی گئی۔ بعدہٗ رزولیوشن مجریہ ۱۹۰۴ء میں اس پر مزید توجہ منعطف کی گئی اور جنوری ۱۹۱۲ء میں حضور ملک معظم آنجہانی نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایڈریس کے جواب میں تعلیم کی عام اشاعت سے ذاتی دلچسپی ظاہر فرمائی۔ تعلیمی رزولیوشن گورنمنٹ ہند مجریہ ۱۹۱۳ء میں گو مالی اور انتظامی وجوہ کی بناء پر لازمی ابتدائی تعلیم کو نافذ کرنے کا اصول منظور نہیں کیا گیا تاہم اس امر کی اہمیت اور ضرورت تسلیم کی گئی کہ ابتدائی تعلیم کی ترقی و توسیع اختیاری اصول پر گورنمنٹ کا اہم مقصد ہے۔ ۱۹۱۷ء کے بعد اصلاحات نافذ ہونے پر محکمۂ تعلیم صیغہ منتقلہ قرار پاکر کلیتہً صوبجاتی گورنمنٹوں کے زیر نگرانی کر دیا گیا ۱۹۱۸ء میں اور اس کے بعد مختلف سنین میں مختلف صوبجات ہند میں محدود پیمانہ پر منتخب

شدہ رقبہ جات میں ابتدائی تعلیم لازمی کی گئی جس کی تفصیل بروئے رپورٹ ۳۳-۱۹۳۲ء حسب ذیل ہے:-

نام صوبہ	تاریخ منظوری قانون لازمی تعلیم	تعداد رقبہ جات لازمی تعلیم قصبات	دیہاتی رقبے	تعداد دیہی رقبہ جات
۱-مدراس	۱۹۲۰	۲۶	۷	۱۰۴
۲-بمبئی	۱۹۱۸ و ۱۹۲۰ و ۱۹۲۳	۱۰	۲	۱۵۰
۳-بنگال	۱۹۱۹	۱	۰	۰
۴-صوبہ متحدہ	۱۹۱۹ و ۱۹۲۶	۳۶	۲۴	۳۵۱
۵-پنجاب	۱۹۱۹	۵۷	۲۹۰۸	۶۲۳۸
۶-بہار و اڑیسہ	۱۹۱۹	۱	۲	۱۵
۷-صوبہ متوسط و برار	۱۹۲۰	۲۵	۴۳۱	۴۳۱
۸-آسام	۱۹۲۶	۰	۰	۰
۹-دہلی	(یہاں صوبہ پنجاب کا قانون نافذ ہے)	۱	۱۰	۱۴

صوبہ متوسط میں لازمی تعلیم کی عمر ۶ سے ۱۴ برس تک۔ صوبجات بنگال و بہار میں ۶ سے ۱۰ سال تک اور بقیہ صوبجات میں ۶ سے ۱۱ سال تک رکھی گئی ہے۔

گورنمنٹ ہند کی مذکورۂ بالا تعلیمی پالسی کی بناء پر لوکل گورنمنٹوں کی کوشش سے وقتاً فوقتاً ابتدائی تعلیم کی توسیع کی اسکیمیں تمام صوبجات میں جاری ہوئیں ان اسکیموں کے عمل میں آنے اور بعد کو تعلیم لازمی ہونے کی وجہ سے ابتدائی مدارس میں تعلیم پانے والے طلباء کی تعداد میں سال بہ سال معتد بہ ترقی ہوتی گئی۔ جملہ صوبجات برٹش انڈیا میں مارچ ۱۹۰۶ء میں پرائمری درجات میں پڑھنے والے لڑکوں کی کل تعداد ۲۵،۷۴،۰۰۰ تھی مارچ ۱۹۳۲ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۸۲،۷۰،۴۹۴ ہوگئی۔ انھیں درجات میں مسلمان لڑکوں کی تعداد جو مارچ ۱۹۰۶ء میں ۷،۱۲،۴۶۵ تھی مارچ ۱۹۳۲ء میں ۲۲،۴۵،۸۳۸ ہوگئی۔

اگر ہر صوبہ کے خواندہ اشخاص کے فی صدی اعداد کو بھی مدنظر رکھا جائے جو میں ابھی بتاؤں گا تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باوجود پرائمری تعلیم کی مذکورہ بالا نمایاں تعدادی ترقی کے کل ملک کو خواندہ بنانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ خواندوں کے اعداد میں جملہ اقوام کے مرد و عورتیں دونوں شامل ہیں۔

نام صوبہ	فی صدی خواندہ اشخاص	نام صوبہ	فی صدی خواندہ اشخاص
۱۔ برہما	۳۱٫۷	۹ صوبہ متوسط و برار	۵٫۶
۲۔ کورگ	۱۵٫۵	۱۰۔ پنجاب	۵٫۳
۳۔ دہلی	۱۴٫۴	۱۱۔ بلوچستان	۴٫۷
۴۔ اجمیر میرواڑہ	۱۰٫۰	۱۲۔ صوبہ متحدہ	۴٫۷
۵۔ بنگال	۹٫۴	۱۳۔ بہار و اڑیسہ	۴٫۴
۶۔ مدراس	۹٫۲	۱۴۔ صوبہ سرحدی	۴٫۱
۷۔ بمبئی	۹٫۲		
۸۔ آسام	۷٫۵	کل برٹش انڈیا	۹٫۵

اب اس پر غور کرنا ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم کی موجودہ حالت کیا ہے۔ آیا موجودہ نظام ابتدائی تعلیم سے ملک کی واقعی ضروریات پوری ہو رہی ہیں یا نہیں اور بصورت آخر کن تدابیر سے موجودہ نقائص رفع ہو سکتے ہیں۔ پرائمری مدارس کی درجہ وار تعداد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۹۳۲ء کی کل میزان میں سے ۵۷٫۶ فی صدی اطفال ابتدائی دو درجوں میں داخل تھے اور ان مدارس کے سب سے اونچے درجہ میں جس کو پاس کرنے کے بعد وہ خواندوں میں شمار ہونے کے قابل ہوتے ہیں صرف ۸٫۶ فی صدی طلبہ تھے۔ انہیں اعداد کے مقابل مسلمان لڑکوں کے فی صدی اعداد بالترتیب ۶۳٫۷ اور ۱٫۵ ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان مدارس میں رفتار ترقی کس قدر سست ہے اور ملک میں خواندوں کی تعداد بڑھانے میں اُن سے کتنی مدد مل رہی ہے۔ موجودہ صورت حال کے خاص اسباب یہ ہیں:۔ طریقۂ تعلیم کا دلچسپ اور بچوں کی فطرت اور ماحول

کے مطابق نہ ہونا۔ عام طبقہ کے لوگوں کا افلاس اور تعلیم سے بدشوقی۔ اور مدرسہ میں پڑھنے والے طلبہ کی کثرت غیر حاضری۔ اس ضمن میں یہ بیان کر دینا نہایت ضروری ہے کہ ہر صوبہ کے جملہ افسران تعلیم کی توجہ مستقل طور پر ان نقائص کو رفع کرنے پر ہمیشہ مبذول رہتی ہے جن کی وجہ سے کہیں کہیں مفید نتائج بھی ظاہر ہوئے ہیں لیکن اس وقت تک کوئی تدبیر مؤثر اور مستقل طور پر کارگر ثابت نہیں ہوئی ہے جیسا کہ خود اعداد مذکورہ سے ظاہر ہے۔

میری ناچیز رائے میں مسئلہ ابتدائی تعلیم کے حل کرنے اور بتدریج موجودہ خرابیوں کو دور کرنے کے اصلی ذرائع یہ ہیں:-

(۱) پرائمری مدارس کے مدرسین کو جن میں سے تقریباً نصف غیر ٹریننگ یافتہ ہیں بچوں کے نفسیات اور جدید ترین طریقہ ہائے تعلیم سے جو دیگر ممالک میں کامیاب ثابت ہو رہے ہیں بخوبی آگاہ کرنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔ نیز اس زمانہ کی مفید تحریکات مثلاً بوائے اسکاؤٹنگ۔ جونیر ریڈ کراس۔ اصلاح دیہات وغیرہ میں مہارت پیدا کرنے کے مواقع اُن کو بہم پہونچائے جائیں۔

(۲) دیہات وقصبات کی تعلیمی لوکل کمیٹیوں کو بیدار کر کے اپنے فرائض انجام دینے پر آمادہ کیا جائے تاکہ وہ مدرسین کی نگرانی کرنے کے علاوہ اُن کو امداد بھی دیں اور کوشش کر کے دیہاتی مدارس کو مواضعات کی سماجی زندگی اور اصلاح دیہات کا مرکز بنائیں۔

(۳) تیسری تدبیر جو نہایت اہم ہے یہ ہے کہ عام ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی کر دیا جائے۔

(۴) کم از کم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ امر بھی بسا ضروری بلکہ ناگزیر ہے کہ پرائمری مدارس میں ابتدائی مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے جس کی اہمیت ہارٹوگ کمیٹی نے بھی تسلیم کی تھی۔

لازمی تعلیم کی تجویز کے خلاف ممکن ہے کہ بعض اصحاب یہ اعتراض فرمائیں کہ اول تو اس قدر کثیر رقوم موجودہ مالی مشکلات کے دور میں کہاں میسر آسکتی ہیں جن سے سارے ملک میں اس اسکیم کا نفاذ ہو سکے۔ دیگر یہ کہ آج کل اُن محدود رقبہ جات میں یہاں لازمی تعلیم کی

اسکیم کا نفاذ ہو چکا ہے اضافہ تعداد طلبہ مندرجہ رجسٹر کے سوا تعلیمی نتائج کے اعتبار سے بمقابلہ اُن مقامات کے جہاں لازمی تعلیم کی اسکیم ہنوز جاری نہیں ہوئی ہے کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا۔
اس کے جواب میں میں نہایت ادب سے یہ عرض کروں گا کہ صوبہ ہذا کے تقریباً تمام میونسپل و دیہاتی رقبہ جات لازمی تعلیم معائنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگر اسکول کمیٹیاں اپنے فرائض کو مستعدی اور سرگرمی سے انجام دینے لگیں تو لازمی تعلیم کی اسکیم ضرور بتدریج کامیاب ہوسکتی ہے جیسا کہ بعض مقامات میں اب بھی کسی حد تک پایا جاتا ہے۔ رہا روپیہ کا مسئلہ تو اس کا کوئی نہ کوئی انتظام ملک کو دیگر ترقی یافتہ ممالک کی سطح پر لانے کے واسطے ارباب حل و عقد کو اب نہیں تو کچھ عرصہ بعد کرنا ہی پڑے گا۔
نظام تعلیم کی اصلاحی تدابیر کے علاوہ یہ بھی نہایت اہم ہے کہ جملہ افسران تعلیم و مدرسین ابتدائی تعلیم کے مقاصد اصلی کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ میں انگلستان ایلی منٹری ایجوکیشنل پراویژنل کوڈ ۱۹۲۴ء کے دیباچہ کے اس حصہ کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جس میں نہایت خوبی اور جامعیت سے ان مقاصد کی تصریح کی گئی ہے:
"پبلک ایلی منٹری اسکول یعنی سرکاری ابتدائی مدرسہ میں جو بچے تعلیم پانے کے لئے داخل ہوں ان کی سیرت کی تشکیل و تاسیس اور ان کی ذہنی تربیت کی جائے اور جتنی مدت لڑکیاں اور لڑکے اسکول میں رہیں اُسی دوران میں ان کی مختلف ضروریات کے مطابق ایسی امداد کی جائے کہ وہ آئندہ چل کر عملی نیز ذہنی طور پر اپنی زندگی کے کاموں کو انجام دینے کے قابل ہو جائیں۔
اس مدعا کو مدنظر رکھتے ہوئے مدرسہ کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ ہوشیاری سے بچوں میں مشاہدہ اور صفائی سے استدلال کرنے کی عادات پیدا کرے تاکہ وہ کچھ قدرتی حالات اور قوانین کو سمجھ کر اُن سے آشنا ہو جائیں۔ ان میں بنی نوع انسان کے اعلیٰ مقاصد اور کارناموں سے اصلی دلچسپی لینے کا شوق پیدا کرے۔ انھیں اپنے وطن کے ادب اور تاریخ سے کسی حد تک مانوس کر دے تاکہ ان کو زبان پر اس قدر ملکہ ہو جائے کہ وہ اس کے ذریعہ اظہار خیال اور ادائے مطلب پر قادر ہو جائیں۔ اور اس سے آگاہ کرتے ہوئے کہ ان کا علم محدود ہے ان میں عمدہ کتابوں کے پڑھنے اور فکر طلب مطالعہ کے ذوق کو نشو و نما دے تاکہ وہ آئندہ چل کر خود اپنی کوشش سے اپنے

علم میں اضافہ کرنے کے قابل ہو جائیں۔

اسی کے ساتھ مدرسہ میں بچوں کو موزوں قسم کے عملی کام اور دستکاری کے ذریعہ ہاتھ اور آنکھ سے کام لینے کی ہمت دلائی جائے اور اُن کے جسموں کی بالیدگی اور صحت کی غرض سے بچوں کو مناسب جسمانی ورزشوں میں مہارت حاصل کرنے اور باقاعدہ کھیلوں میں حصہ لینے کے مواقع بہم پہونچانے کے علاوہ آسان قوانین صحت سے بھی آگاہ کیا جائے"۔

اس کے بعد محولہ دیباچہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مدرسین کو مدرسہ اور کھیل کے میدان میں اچھا ضبط قائم کرکے نیز اپنی عمدہ مثال اور ذاتی اثر سے بچوں میں محنت، ضبط نفس، استقلال، ادب، ایثار، راستی، پاکبازی، جماعتی زندگی اور وفاداری کی صفات عالیہ پیدا کرنی چاہئیں۔ اور ان سب کوششوں میں طلبہ کے سرپرستوں سے اشتراک عمل کرنا چاہئے تاکہ بچے ابتدائی مدرسہ چھوڑنے پر نہ صرف یہ کہ ذاتی طور پر ہی عمدہ اخلاق کا نمونہ پیش کریں بلکہ جس جماعت سے اُن کا تعلق ہے اس کے راست باز اور مفید افراد اور اپنے وطن کے قابل فرزند ثابت ہوں۔

حضرات! آپ مجھے اجازت دیں کہ اپنے بیان کو ختم کرنے سے قبل میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم اور اُن کے مخصوص مدارس کا اجمالی تذکرہ کردوں۔ جملہ تعلیم یافتہ اصحاب اس امر سے واقف ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونے پر جب اُن کا اپنا قدیمی نظام تعلیم مختلف وجوہ سے برباد ہوگیا تو انھوں نے عرصۂ دراز تک نئی حکومت کے قائم کردہ نظام تعلیمی سے اول تو فائدہ اُٹھایا ہی نہیں اور اُٹھایا بھی تو بہت کم جس کی وجہ سے وہ تعلیمی ترقی کی دوڑ میں اور اسی کے نتیجہ کے طور پر زندگی کے دیگر مختلف شعبوں میں بھی اپنی ہمسایہ دیگر اقوام سے بہت پیچھے رہ گئے اور آج تک اس کمی کو پورا نہیں کرسکے ہیں۔ ان کی اس روش کو عام طور پر ان کی قومی بداقبالی۔ تبدیلی حالات کی وجہ سے اجماعی و انفرادی تنزل و افلاس۔ قدامت پرستی۔ لاپروائی یا ناعاقبت اندیشی پر محمول کیا گیا ہے اور کچھ حد تک یہ الزامات بیجا بھی نہیں ہیں لیکن ٹھنڈے دل سے اور ہمدردی و انصاف سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے مذکورۂ بالا طرز عمل کا اصل محرک کچھ اور ہی ہے حقیقت

یہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم بالخصوص ہماری قوم کے عام طبقے مذہب سے اس قدر وابستہ اور اپنی مخصوص معاشرت و تمدن کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ وہ ہر تعلیمی نظام میں ان دونوں عناصر کا شمول لازمی خیال کرتے ہیں خدا کا شکر ہے کہ غریب سے غریب مسلمان کی بھی خواہ وہ خود تعلیم سے بے بہرہ ہو یہی دلی تمنا ہوتی ہے کہ اُس کا بچہ کم از کم کلام مجید کو ناظرہ پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ میں نے خود اکثر مواضعات میں دیکھا ہے کہ ایسے غریب مسلمان اسی غرض سے اپنا پیٹ کاٹ کر چندہ سے میاں جی مقرر کرتے ہیں۔ در اصل جدید قائم شدہ نظام سے اسی بنا پر وہ کماحقہٗ مستفید نہیں ہوئے کہ اُس میں مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں ہے اور عام نصاب تعلیم میں اُن کی تاریخ و معاشرت کی بہت کم جھلک پائی جاتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انھیں وجوہ کی بنا پر مسلمانوں نے اپنی تعلیمی پسماندگی کا احساس کرنے اور تلافی مافات کی کوشش شروع کرنے کے بعد بھی اب تک تعلیمی نظام میں اپنی قومی انفرادیت باقی رکھی ہے اور ہندوستان کے ہر صوبہ میں اُن کی ابتدائی تعلیم کے لئے مخصوص مدارس و مکاتب قائم ہیں جن میں مسلمان بچوں کی کثیر تعداد تعلیم پا رہی ہے۔ مسلمانوں کے مخصوص مدارس دو قسم کے ہیں۔ اول علٰحدہ پرائمری مدارس جن میں وہی خواندگی پڑھائی جاتی ہے جو عام پرائمری مدارس میں رائج ہے لیکن عملہ میں جملہ مدرسین مسلمان ہوتے ہیں۔ دوم خاص درسگاہیں جن کا نصاب عام مدارس کے نصاب سے مختلف اور مسلمانوں کی ضرورت اور مذاق کے مطابق ہوتا ہے اور جن میں مذہبی تعلیم کسی نہ کسی شکل میں لازماً دی جاتی ہے۔ آخر الذکر مدارس ملّا اسکول یا مکتب کے نام سے موسوم ہیں۔ ملّا اسکول زیادہ تر سندھ میں اور مکاتب صوبجات بنگال و آسام و بہار و صوبہ متحدہ میں ہیں۔ علٰحدہ پرائمری مدارس صوبجات مدراس و بمبئی و صوبہ متوسط و صوبہ متحدہ میں کافی تعداد میں ہیں۔ بیشتر صوبوں میں مسلمانوں کے مخصوص مدارس میں ذریعۂ تعلیم اُردو زبان ہے۔ صوبہ بمبئی میں اُردو ورنیکلر اور ورنیکلر اردو دو قسم کے پرائمری مدارس قائم ہیں جن میں اردو کی تعلیم لازمی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان مخصوص درسگاہوں میں سے بعض کا تعلیمی معیار معلّمین کی کم لیاقتی مکانوں کی تنگی یا غیر موزونیت، سامان تعلیمی کی قلت یا انتظام کی خرابی کی وجہ سے بمقابلہ

عام سرکاری مدارس کے کمزور یا پست ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلمان بچوں کی بڑی تعداد جو اُن کے نہ ہونے پر علم سے قطعاً محروم رہ جاتی انھیں کی بدولت علاوہ مذہبی تعلیم کے دنیوی تعلیم بھی حاصل کرتی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف ہارٹوگ کمیٹی نے بھی کیا ہے۔

مسلمان بچوں کے عام مدارس میں داخل نہ ہونے سے یقیناً علاوہ دیگر چند نقصانات کے دو بڑے نقصان یہ بھی ہیں کہ وہ دیگر اقوام کے بچوں سے میل پیدا کرنے اور تعلیمی میدان میں اُن سے مقابلہ کر کے اپنی لیاقت بڑھانے سے قاصر رہتے ہیں حالانکہ یہ دونوں امور ملکی ضروریات کے لحاظ سے اس زمانہ میں بسا ضروری ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کے حل کی یہی دو صورتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو عام پرائمری مدارس میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ مسلمانوں کو اُن کی جانب سے جو بے اعتمادی ہے وہ رفع ہو جائے اور وہ زیادہ تعداد میں اپنے بچوں کو اُن میں داخل کرائیں یا مخصوص اسلامی درسگاہوں کی موجودہ کمزوریاں رفع کرنے کے واسطے مزید رقوم مہیا کر کے اُن کی اصلاح و ترقی کی باقاعدہ کوشش کی جائے۔

ایجوکیشنل کمشنر گورنمنٹ ہند نے اپنے پنج سالہ تعلیمی ریویو بابت سنین ۲۷-۱۹۳۲ء میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارہ میں ایک موقع پر جن واقعات کا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم ہیں۔ لہذا میں ان کو نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کا ریمارک یہ ہے: "عام مدارس میں مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کی غرض سے ہارٹوگ کمیٹی نے تجویز کیا تھا کہ اُن میں مذہبی تعلیم کے مواقع بہم پہنچانے کی کوششیں کی جائیں۔ مسلمان مدرسین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور مسلمان متعلمین کے واسطے خاص تعداد میں جگہیں محفوظ رکھی جائیں۔ گو یہ تجاویز مشکلات سے مملو ہیں امور مجوزہ کے متعلق کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی ہے۔ جب تک کہ علحدہ اور مخصوص درسگاہیں بڑی تعداد میں باقی رہیں گی، مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں سخت رکاوٹ حائل رہے گی۔"

اس موقع پر حاضرین جلسہ کی آگاہی و دلچسپی کے خیال سے میں مسلمانوں کے صوبہ وار تعلیمی اعداد و شمار پیش کرتا ہوں۔ یہ اعداد ۳۲-۱۹۳۱ء کی رپورٹ سے لئے گئے ہیں اور

جملہ شعبہ جات تعلیم پر حاوی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ ان میں تمام غیر تسلیم شدہ پرائیویٹ درسگاہوں اور پرائمری مدارس کے اعداد بھی شامل ہیں جن کے طلبہ کا بیشتر حصہ ادنیٰ درجات میں ہے :۔

نام صوبہ	تناسب مسلم مردم شماری		تناسب مسلم طلبہ بمقابلہ کل مسلم مردم شماری		تناسب مسلم طلبہ بمقابلہ کل تعداد طلبہ جملہ اقوام	
۱۔ مدراس	۷ر۱	فی صدی	۷ر۹	فی صدی	۹ر۱۰	فی صدی
۲۔ بمبئی	۴ر۲۰	"	۸ر۵	"	۴ر۱۹	"
۳۔ بنگال	۹ر۵۴	"	۲ر۵	"	۷ر۵۱	"
۴۔ صوبہ متحدہ	۸ر۱۴	"	۹ر۳	"	۶ر۱۸	"
۵۔ پنجاب	۵ر۵۶	"	۱ر۵	"	۶ر۵۰	"
۶۔ برہما	۴ر۰	"	۵ر۵	"	۴ر۵	"
۷۔ بہار و اڑیسہ	۳ر۱۱	"	۵ر۳	"	۵ر۱۳	"
۸۔ صوبہ متوسط و برار	۴ر۴	"	۲ر۷	"	۷ر۱۰	"
۹۔ آسام	۰ر۳۲	"	۹ر۳	"	۲ر۲۹	"
برٹش انڈیا (بشمول کل چھوٹے انتظامی علاقوں کے)	۷ر۲۴	"	۲ر۵	"	۷ر۲۶	"

آخر میں میں نہایت ادب سے بزرگان کانفرنس کو چند امور کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں جو مسلمانان ہند کی ابتدائی تعلیم کی توسیع و اصلاح کے متعلق اس قومی ادارہ کو منضبط طریقہ سے مستقل طور پر عمل میں لانے چاہئیں :۔

۱۔ کانفرنس آفس میں ایک علیحدہ صیغہ ابتدائی تعلیم کے متعلق مصرحۂ ذیل کاموں کو انجام دینے کی غرض سے قائم کیا جائے :۔

(الف) تمام صوبجات کے سررشتہ ہائے تعلیم کی سالانہ رپورٹوں سے ہر قسم کے مدارس ابتدائی بالخصوص اسلامی مدارس و مکاتب کے ضروری اعداد و شمار لیکر گوشوارے اور بشرط ضرورت چارٹ تیار کرنا جن میں کل تعداد طلبہ و تعداد مسلم طلبہ ظاہر کی جائے نیز مسلمان طلبہ کی تعلیمی ترقی کے بابت جو آرا رپورٹوں میں ظاہر کی گئی ہوں ان کے اقتباسات نقشوں کے ہمراہ رکھے جائیں۔

(ب) ہر صوبہ کے جملہ اقسام ابتدائی مدارس کے نصاب ہائے تعلیم اور اسلامی مکاتب کی مروّجہ کتب درسی کو حاصل کرنا تاکہ بشرط ضرورت اُن کی جانچ کر کے اصلاحی تجاویز مرتب کی جاسکیں۔

(ج) مختلف صوبہ جات کے سرکاری یا غیر سرکاری ماہران تعلیم سے جن کو مقامی حالات سے پوری واقفیت ہو ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں وہاں کے مسلمانوں کی مشکلات و ضروریات و تدابیر اصلاح کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنا۔

۲۔ علی گڑھ میں چند مسلمان ماہران تعلیم کی ایک مستقل سب کمیٹی بنائی جائے جو حاصل کردہ معلومات پر غور و خوض کرنے کے بعد کانفرنس کی سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کو ضروری کارروائی کے متعلق مناسب عملی مشورے دے۔ اس سب کمیٹی کا خاص فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اسلامی درسگاہوں کے نصابوں اور کتب درسی کی اس نگاہ سے جانچ کرے کہ وہ ملک کے عام مدارس کے معیار کے مساوی ہیں یا نہیں۔ اردو ریڈروں کی زبان کیسی ہو۔ اور ان کے اسباق مخصوص اسلامی ضروریات کو کس حد تک پورا کرتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو انکی اصلاح کی عملی تجاویز بتائے۔ کم و بیش اسی نوعیت کی کانفرنس کی دو کمیٹیوں کا جو ۱۹۱۴ء میں عارضی طور پر بنائی گئی تھیں) یہ طفیل ہے کہ ۱۹۱۶ء میں صوبہ متحدہ کی اسپشل اسکیم منظور ہوئی جس کے فوائد اظہر من الشمس ہیں۔

۳۔ ہر صوبہ میں کانفرنس ایک کمیٹی قائم کرے جس کے ذریعہ اس کو اپنی تجاویز کو کامیاب بنانے میں مدد ملے۔

۴۔ چند سفیر محض اس کام کے واسطے مستقل طور پر مقرر کئے جائیں کہ ان کو حسب

ضرورت مختلف مقامات کو مقامی تحقیقات کے واسطے یا باشندگان میں تعلیمی پروپگنڈہ کرنے کی غرض سے بھیجا جائے۔ صوبۂ متحدہ میں ۱۹۱۶ء کی اسپشل اسکیم کا نفاذ ہونے پر صوبہ بھر میں مکاتب قائم کرانے کے سلسلہ میں جو گراں قدر خدمات اس کانفرنس کے سفیروں نے انجام دی تھیں ان سے باخبر اصحاب پوری طرح واقف ہیں۔

۵۔ گزشتہ زمانہ میں دفتر کانفرنس صوبۂ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم کی معرفت تمام اضلاع کے ورنیکولر مدارس سے نمونہ جات اردو خوشخطی طلب کرکے ہر درجہ میں بہترین نمونوں پر چند انعام دیتا تھا۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اب بھی ایسا ہوتا ہے یا نہیں۔ مبادا اگر کسی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہو گیا ہو تو اس کو پھر از سر نو جاری کیا جائے۔

حضرات! آپ نے جس تحمل اور صبر سے میرے روکھے پھیکے بیان کو سنا اس کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ وما علینا الا البلاغ۔ و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین۔

آل علی نقوی

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنے

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

جناب نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکرٹری کانفرنس

مہینہ میں چار بار شائع ہوتا ہی اور اس میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک مسائل تعلیم و تربیت موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کی جاتی ہی۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہی اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہی۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہی۔ اخبار بہت عمدگی و نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہی اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کر کے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہی۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہی۔ قیمت سالانہ ؏ ۳

اڈیٹر: محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ:۔ سید الطاف علی (بی اے) منیجر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

خطبۂ صدارت

شعبۂ اعلیٰ تعلیم

جناب عبداللہ یوسف علی صاحب

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی "پنجاہ سالہ جوبلی" کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا، وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا! ور ہر شعبہ کا ایک علٰحدہ صدر اور سکرٹری تھا۔

چنانچہ منجملہ ان شعبوں کے ایک "شعبہ اعلٰی تعلیم" تھا جس کا اجلاس ۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء کی صبح کو اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا۔

اس شعبہ کے صدر جناب عبداللہ یوسف علی صاحب ایم اے، ایل ایل ایم، سی بی ای، آئی سی ایس ریٹائرڈ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور اور سکرٹری پروفیسر محمد حبیب صاحب (مسلم یونیورسٹی) اور جائنٹ سکرٹری مسٹر عبدالغفور صاحب استاد ٹریننگ کالج (مسلم یونیورسٹی) تھے اس موقع پر بحیثیت صدر جناب عبداللہ یوسف علی صاحب نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اُس کا ترجمہ اس "تعارف" کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ صدارت شعبۂ اعلیٰ تعلیم

از

جناب عبداللہ یوسف علی صاحب

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اپنی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر قابل مبارکباد ہے، گزشتہ دو تین سال کے اندر پچیس سالہ جوبلیاں تو کئی ہوئیں لیکن پنجاہ سالہ جوبلی کا موقع کبھی کبھار ہی آتا ہے مسلسل تعلیمی خدمت میں پچاس سال پورے کر دینا ہی ہر انجمن کے لئے طغرائے امتیاز ہو سکتا ہے مگر اس قسم کی جوبلی کا مقصد صرف یہی نہ ہونا چاہئے کہ اپنی کارکردگی مطمئن ہو کر قانع ہو جائیں بلکہ ضروری ہے کہ اپنے سالہائے گزشتہ کا جائزہ لیں، موجودہ حالت کی جانچ کریں اور آئندہ کے لئے میدان ترقی کو وسیع تر بنانے کی کوشش کریں،

موجودہ اصحاب میں ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جن کو ۱۸۸۶ء کے واقعات معلوم ہوں اکثر تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے تمام قلمروے برطانیہ میں اس سال ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی پنجاہ سالہ جوبلی منائی گئی،

تعلیمی دنیا میں اس طے شدہ فاصلہ کا ہم کئی طریقوں سے اندازہ کر سکتے ہیں اگر یونیورسٹی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو اُس وقت صرف چار یونیورسٹیاں تھیں یعنی تین پریزیڈنسی یونیورسٹیاں اور ایک پنجاب یونیورسٹی الٰہ آباد یونیورسٹی ۱۸۸۹ء تک معرض وجود میں نہیں آئی

تھی، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تو ۱۹۲۰ء ہی میں پیدا ہوئی ہے،

جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی یونیورسٹیاں نہایت سرعت کے ساتھ وجود میں آنے لگیں اور اس وقت ہندوستان میں ۱۸ یونیورسٹیاں موجود ہیں۔

ایجوکیشن کمیشن نے ۱۸۸۲ء میں مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے تین اسباب علاوہ معاشرتی اور روایتی اسباب کے بیان کئے ہیں:۔

(۱) مسلمان لڑکا بہ نسبت ہندو لڑکے کے بڑی عمر کا ہو کر مدرسہ میں داخل ہوتا ہے کیونکہ اس کو چند سال مذہبی تعلیم پر صرف کرنا پڑتے ہیں قبل اس کے کہ وہ عام دنیوی تعلیم کی طرف متوجہ ہو سکے،

(۲) متوسط الحال مسلمان والدین عام طور پر اپنے ہم رتبہ ہندو والدین سے زیادہ مفلس ہوتے ہیں،

(۳) مسلمانوں نے تعلیم کا مقصد محض عربی فقہ اور دینیات کی تحصیل سمجھ لیا ہے نہ کہ ان علوم و فنون کی تحصیل جو مفید پیشوں کے لئے کارآمد ہوں اس وجہ سے محض دنیوی اور مروجہ تعلیم میں وہ ضرور پیچھے تھے، لیکن اگر عام مدرسوں اور قرآن خوانی کے مکاتب کو شمار میں لے لیا جائے تو تعلیم یافتہ مسلمانوں کا تناسب ہمیشہ ان کی عام آبادی کے تناسب سے بڑھا ہوا پایا جائے گا،

۱۸۸۵-۸۶ء میں مسلمان طلباء کا تناسب کل طلباء کے مقابلہ میں ۲۳،۶ تھا اور مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کے مقابلہ میں ۱۹،۱ تھی لیکن انگریزی کے آرٹ کالجوں میں مسلمان طلباء کی تعداد کا تناسب ۴،۴ تھا اور پیشہ وری کے کالجوں میں تناسب ۱،۵ تھا، آرٹ اور پیشہ وری کے کالجوں میں مسلمانوں کی تعداد حسب ذیل تھی:۔

سال	آرٹ کالج	پیشہ وری کے کالج
۱۸۸۱-۸۲ء	۱۹۷	۷۳
۱۸۸۵-۸۶ء	۳۳۰	۱۳۲
۱۹۳۴ء	۱۲۱۵۸	۲۲۷۹

اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں:۔

اولاً مسلمانوں کا تناسب (۶۔۵۴) آرٹ اور پیشہ وری کی تعلیم میں جو ۸۶-۱۸۸۵ء میں یونیورسٹی میں داخل تھے، طلباء یونیورسٹی کی مجموعی تعداد ۱۰۵۳۸ کے لحاظ سے ۵ء۴ تھا اور یہی تناسب ۱۹۳۳ء میں (۱۰۶۰۰۰ و ۴۴۰۰) یعنی ۶ء۱۳ ہوگیا، اگران اعداد سے کوئی اطمینان بخش حالت نظر آتی ہے تو وہ ایک دوسرے پہلو سے زائل ہو جاتی ہے یعنی مسلمانوں کا تناسب پیشہ وری کے کالجوں میں بمقابلہ اُن طلباء کے جو آرٹس کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں ۸۶-۱۸۸۵ء میں ۔۴ فی صدی تھا لیکن ۱۹۳۳ء میں صرف ۹ فی صدی رہ گیا یہ تنزل بہت افسوس ناک ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یونیورسٹی کے مسلمان طلباء کا تناسب جو اعلیٰ پیشوں (مثلاً ڈاکٹری (طب جدید)، انجینیری اور قانون) کی تعلیم حاصل کرتے ہیں پچاس سال کے عرصہ میں بہت کم ہو گیا ہے،

یہ کانفرنس سرسید احمد خاں کے تعلیمی نظریۂ تصورات کا نتیجہ ہے، مرحوم کی مقامی کوششوں کا نتیجہ ایم اے او کالج کی صورت میں ظاہر ہوا اجواب مسلم یونیورسٹی مع ملحقہ اداروں کی شکل میں موجود ہے اس سے وسیع تر اور نسبتاً غیر مقامی تصورات کا ظہور اس سالانہ کانفرنس کی شکل میں وجود میں آیا جس کے اجلاس ہندوستان کے مختلف مرکزی مقامات پر منعقد ہوتے ہیں اور جس کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبجات اور ریاستوں میں مسلمانوں کی تعلیم پر تنقید و تبصرہ کرے اور اس کی ترقی کے ذرائع پر غور کرے، یہ کانفرنس مسلمانوں کی تعلیمی کوششوں میں جو ہندوستان کے دیہات اور قصبات میں ہو رہی ہیں طاقت اور امداد پہنچاتی ہے گو اس کو تمام مسلم انڈیا کی تعلیمی اطلاعات کا تبادلہ خانہ کہنا تو جائز نہ ہوگا لیکن یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ اس کا مدعا یہ ہے کہ مختلف مقامی حالتوں پر وقتاً فوقتاً مرکزی تنظیم کی روشنی ڈالے اور جہاں ممکن ہو مقامی کوششوں کی دستگیری کرے اور اس طرح ان کو ایک رشتہ میں منسلک کرے اور علی گڑھ یعنی مسلمانوں کے تعلیمی مرکز سے ان کے تعلقات پیدا کرے گیا اب اتنی مدت کے بعد ہم سرسید احمد خاں کے تعلیمی تصورات پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر ان کو مختصر جملوں کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں؟

سرسید مرحوم کے آخری ایام میں مجھ کو ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا اس گفتگو

کا کچھ حصہ مجھ کو اب بھی یاد ہے جو مرحوم کے ساتھ مسلمانوں کے احیاء کے متعلق ہوئی تھی میں اُس وقت سرکاری ملازمت میں داخل ہونے والا تھا ۴ بہت سے عہدے جنھیں ہم نوجوان آسانی سے حاصل کر لیتے تھے اُنھیں سرسید کے ہمعمروں نے بہت محنت سے حاصل کیا تھا، بہت سے خواب جو ہم دیکھتے تھے زمانہ کے اثر سے پختہ نہ ہوئے تھے، بہت سے انکشافات جو سرسید اور اُن کے رفقائے کار پر ہوئے ہم کو حقیر معلوم ہوتے تھے، لیکن اب بیسویں صدی میں آکر وہی اہم اور مشکل نظر آتے ہیں، کوئی غیر مشروط صاف بیان کسی بڑے آدمی کے اصول کے متعلق کبھی پوری حقیقت واضح نہیں کر سکتا، میرا خیال ہے کہ اس کا لحاظ رکھ کر علی گڑھ تحریک کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ابتدائی زمانہ سے اپنے پروگرام کے مندرجۂ ذیل امور پر خاص زور دیا ہے،

(۱) اس جمود کا علاج جو مسلمانانِ ہندوستان کے دماغوں پر ان کی حکومت کے زوال کے بعد چھا گیا تھا مروجہ تعلیم ہی ہو سکتی ہے،

(۲) ہمارے لئے مروجہ تعلیم انگریزی زبان اور مغربی سائنسوں کے ذریعہ زیادہ موثر ہو سکتی ہے،

(۳) مذہبی اوہام کی پابندی جو نہایت عجیب و غریب حالت میں مسلمانانِ ہندوستان پر مسلط ہے صرف مذہبی فلسفہ کے بہت سے بنیادی اصول پر از سرِ نو تجزیہ و تحقیق کرنے سے دور کی جا سکتی ہے،

(۴) جدید اجتہاد اور مسائل پر نظرِ ثانی سے زمانۂ حال کے مغربی سائنس کی ترقی نظر انداز نہیں کی جا سکتی بلکہ بخوشی قبول کر لینا چاہئے، کیونکہ نئی روشنی عروجِ اسلام کے زمانہ کے مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں کی محنت کا منطقی نتیجہ ہے،

(۵) علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی زندگی اور قومی اداروں کی ترقی بھی ان اصول پر ہونا چاہئے جو مغرب میں تجربہ کے بعد کامیاب ثابت ہوئے ہیں، بہت سے دماغوں میں "علی گڑھ تحریک" انگریزی لباس اور مغربی عادات و اطوار کے اختیار کر لینے کا ہی نام تھا، اگر ابتدائی زمانہ کی علی گڑھ تحریک کے متعلق یہ بیان صحیح ہے تو ہم فوراً اس نتیجہ پر پہنچ سکتے

۴ میں نے اپنے تعلیمی تصورات جوانی کے جوش اور ولولے کے ساتھ اس تعلیمی مردِ میدان کے سامنے پیش کیے جس نے غدر سے لے کر ملک و قوم کو ... آخری ایام تک ... زمانہ کو بامعنی نظر ...

ہیں کہ اس وقت سے اب تک بہت سی غلط کاریوں کے انکشافات ہوئے ہیں اور علی گڑھ تحریک میں خود بہت سے امور پر حالتِ بازگشت ہو چکی ہے، کوئی زندہ تحریک بغیر ایسی بازگشتوں کے پھل پھول نہیں سکتی، ہم اس کے قائل نہیں کہ مروجہ تعلیم ہی ہماری اُن تمام کمزوریوں کا علاج ہے جن میں ہماری جماعت اور قوم مبتلا ہے، بلکہ برعکس اس کے ہم سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری انڈین یونیورسٹی کی تعلیم میں بہت سے نقائص پائے جاتے ہیں بعض تو اس تعلیم کو برملا بُرا کہتے ہیں کہ یہ تعلیم نہایت غلط راستہ پر ہے اور اس کو یکسر تبدیل کر دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہر وہ شخص جو موجودہ تعلیمی اداروں اور مروجہ تعلیم کو حاصل کرنے والے نوجوانوں سے گہرا تعلق رکھتا ہے ہرگز ایسے انتہا پسندی کے خیال کی تائید نہیں کرے گا، ہم جانتے ہیں کہ طریقِ تعلیم۔ نظم ونسق۔ نفسیاتی تطبیق اور نقطۂ نگاہ میں بہت نقائص ہیں جن کے لئے فوراً معقول علاج کی ضرورت ہے۔ انٹر یونیورسٹی بورڈ نے ابھی چند امور کی طرف توجہ دلائی ہے اور گورنمنٹ ہند کے "محکمہ تعلیم" نے یونیورسٹیوں اور لوکل گورنمنٹوں کو اس معاملہ کے متعلق سرکلر بھی بھیجے ہیں، مالی وسائل کی قلت اور تعلیم یافتہ بیکاروں کی کثیر تعداد نے لوگوں کی توجہ اس مسئلہ پر مرکوز کر دی ہے کہ مبادا یونیورسٹیوں اور گریجوئیٹوں کی تعداد ضرورت سے زائد ہو۔

سر تیج بہادر سپرو کی رپورٹ اور گورنمنٹ صوبجات متحدہ کی پیش از پیش توجہ کے ہم ممنون ہیں جس سے کچھ امید نظر آتی ہے کہ پوری پوری نظرِ ثانی کے بعد یونیورسٹی کی اصلاح بھی ہوگی اور سب مسئلوں پر توجہ کی جائے گی،

یہ تمام ملک کا سوال ہے اور اس سے تمام فرقے متاثر ہوتے ہیں، ہم مسلمانوں پر بھی اس کا خاص اثر ہوگا کیونکہ ہم میں ان افراد کی تعداد جو تجارت اور صنعتی کاموں کو اختیار کرتے ہیں بہت کم ہے، آج کل صنعتی وتجارتی تعلیم کے دائرے کو وسیع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور فارغ التحصیل طلباء کے لئے بہتر ذرائع مہیا کرنے کی بھی سعی جاری ہے اس سے ہماری قوم دیگر ہمسایہ اقوام سے نسبتاً کم مستفید ہوگی، اسلامی آبادی والے صوبجات یعنی پنجاب صوبہ سرحدی سندھ اور بنگال کے مسلمان عوام الناس زراعت پر گزر اوقات کرتے ہیں اور بمبئی کے سوا دوسرے صوبجات میں ان کے بزرگوں کا وسیلۂ معاش عام طور پر حکومت وقت کی ملازمت رہا ہے، ملازمت کی غیر

محدود توسیع کے لئے کوئی گنجائش نہیں، اگرچہ یہ دیکھکر کچھ اطمینان ہوتا ہے کہ آج کل سرکاری حکام مسلمانوں کو ملازمتیں دینے کا کچھ اہتمام کر رہے ہیں لیکن کہاں تک ان احکام پر عملدرآمد ہوتا ہے، یہ اس بیداری پر منحصر ہوگا جس سے ہمارے قومی کارکن اس سوال کا مطالعہ کریں گے اور پوری واقفیت اور سلیقہ سے صوبہ کی اسمبلی اور مرکزی مجلس مقننہ میں اُٹھایا کریں گے، انگریزی تعلیم کی قیمت جو ہم لوگوں میں تھی اب کم ہوگئی ہے، دیسی زبانوں کا سوال بہت پیش پیش ہو رہا ہے، ہندوستانی آبادی کا مسلمان طبقہ ہی ایسا ہے (ماسوائے اینگلو انڈین کے جن کی تعداد نہایت ہی قلیل ہے) جن کی زبان تمام ہندوستان اور دیسی ریاستوں میں مشترک ہے۔ یہ بیان بھی مزید توضیح کا محتاج ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ صوبجاتی خودمختاری کے قائم ہونے اور صوبجاتی حب الوطنی کے نمودار ہونے پر صوبجاتی زبانیں بھی یونیورسٹی میں پیش ہوں گی جیسا کہ بنگال میں ہو رہا ہے کسی خاص نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے میرا ارادہ ہے کہ اس سوال کے اکثر پہلوؤں پر بحث کروں، لیکن میں زور سے عرض کروں گا کہ اگر اُنھوں نے انگریزی تعلیم میں ڈھیل دے دی جو اس وقت ہندوستان میں سلطنت کی زبان ہے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی عرصۂ دراز تک رہے گی، مغربی سائنس کے مطالعہ کے متعلق میں نہیں سمجھتا کہ ہم نے کبھی اس عرصہ میں کافی اشتیاق دکھلایا ہو یا معتدبہ نتائج پیدا کئے ہوں، آج کل سائنس کی حکمرانی ہے جس شخص کو گزشتہ نصف صدی کا تجربہ ہے اس نے ضرور اس پر غور کیا ہوگا کہ ہماری مادی زندگی (انفرادی یا قومی) میں نئے معلومات اور سائنس کی ایجادوں سے کس قدر تغیر واقع ہوا ہے، انسانی تمدن کی آئندہ ترقی کے میدان کی کنجی سائنس داں کے ہاتھ میں ہے، اگر کوئی صاحب ہم میں ایسے بھی ہیں جن کو ہماری تعلیم اور زندگی میں تجرباتی سائنس کی قدر و قیمت کے انکشاف کا احساس ہوتا ہو تو ان سے میں درخواست کروں گا کہ اس سوال کا مطالعہ کرنے میں بے تعصبی اور وسعت نظری کو کام میں لائیں،

اگر بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ سائنس مذہب کے مخالف ہے تو میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اس کے برعکس سائنس جدید تو ہر روز کم مادی یا میکانکی ہوتی جا رہی ہے، نیچر (فطرت) اور انسان کی زندگی میں بڑی بڑی طاقتیں نظر سے پوشیدہ ہیں جن کی تلاش میں ہم نے محض سطحی مطالعہ سے زیادہ غور کے علاوہ گہری غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں کی اس کے یہ معنی تھیں کہ

سائنس اور مذہب ایک ہی شے ہیں۔ لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سچا مذہبی دل جو خدا کی مادّی مخلوق کے تمام اثرات کے لئے تیار ہو، سائنس جدید کی وسیع و حیرت انگیز دنیا کے مطالعہ سے بجائے بے دینی کے ایک نئی قوت حاصل کرے گا۔

ہمارے مذہبی فلسفہ کی جدید تصریح اور جانچ پڑتال کے لئے سرسید کے زمانہ میں بہت تھوڑا سا سامان ملا۔ شاید ان اعتراضات کا بیشتر حصہ جو علی گڑھی گروہ کے مذہبی خیالات پر کئے جاتے تھے ان کے چند مخصوص نظریوں یا منطقیانہ نتائج کے خلاف تھے نہ کہ ان کے طریق کار اور نصب العین پر۔ ممکن ہے کہ تنقید کا کچھ حصہ صحیح بھی ہو اور ہم اپنے علم جدید کے ساتھ اس کا مقابلہ بھی کر سکیں اور اس نئی تصریح اور جانچ پڑتال کو جذبۂ تعظیم و تکریم کے ساتھ اپنی تاریخ کے بہترین زمانہ کی اصلی اور حقیقی روایات تک پہنچانے کے کام میں لگے رہیں۔ لیکن ہم محدود حلقہ میں بند نہیں رہ سکتے ہمارے نوجوان جو ہم کو آج مجبور کر رہے ہیں کل مطالبہ کریں گے کہ ہماری تصریح ہمارے بہترین علم سے مطابقت بھی رکھتی ہے یا نہیں، کسی تنقید کا تسلیم کر لینا لازماً یہ معنے نہیں رکھتا کہ تنقید شدہ امر صحت سے گزر چکا ہے لیکن نیا جامہ پہنانے کی ضرورت پیش آہی جاتی ہے اور ایسی صفات جو ضروری اور لاحق ہو جاتی ہیں اُن کو اپنے مکمل علم کے ساتھ مطابقت دے دینا ضروری ہے، ہماری رائے عامہ کی موجودہ حالت میں یہ امر کہاں تک ممکن ہے ہماری ان کوششوں پر منحصر ہے جو رائے عامہ پر نئی روشنی ڈالنے میں صرف ہوں گی، مذہبی حریفوں کا تنفر جس کے سرسید شکار رہے اب بھی زائل نہیں ہوا، اب وہ دوسری اشکال میں ظاہر ہوتا ہے اور بعض وقت سیاسی تنفر کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر پیش آتا ہے، اگر ہماری تربیت طوطی وار رٹنے اور امتحان کو مد نظر رکھنے پر ہی موقوف ہے تو ہم اس آزاد قوت فیصلہ کا مقام نہ پا سکیں گے جس سے شریف کوششیں ابھرتی اور رذیل دبتی ہیں،

اعلیٰ تعلیم کا بڑا مقصد جیسا کہ میں سمجھتا ہوں انسانوں کو انفرادی، اجتماعی، معاشرتی اور روحانی اعلیٰ اور مکمل زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرتا ہے اور جن لوگوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو، ان پر واجب ہے کہ لوگوں کے لئے قیادت کے مواقع مہیا کریں، مغربی

تمدن کی خارجی اور مادی شکل سے ہندوستانی دن بدن متنفر ہو رہا ہے۔ شاید لنگر اپنی جگہ سے بہت دور چلا گیا ہے، خوف ہے کہ مبادا اس چکر میں مروجہ سائنس اور تمدن کی تعلیم کے ضروری پہلو اور صحیح مفہوم نہ ضائع ہو جائیں۔

بیکاری کی وجہ صرف ناقص تعلیم ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔ سب سے اول تو دنیا بھر کی تجارت کی کساد بازاری جس نے بین الاقوامی تجارت، بین الاقوامی تبادلۂ زر بذریعہ بنک، بین الاقوامی لین دین اور بین الاقوامی سیاسی تعلقات کا شیرازہ بکھیر دیا ہے، ایسے حالات میں جن ملکوں کے معاشرتی حالات مستقل نہیں یا وہ ممالک جو صرف پختی پیدا وار مہیا کرتے تھے اور جن کے لئے بازار محدود ہے اس مصیبت (انحطاط) کی سخت لپیٹ میں آتے ہیں۔

ہندوستان ہمیشہ سے زراعتی ملک ہے اس کے اپنے گھر کا دساور اور اندرونی تجارت لین دین بذریعہ بنک پر تیت (ساکھ) کی نشو و نما نہیں ہوئی، اور جدید حالات کے مطابق بھی نہیں کئے گئے،

ہندوستان کے جماعتی حالات میں اندرونی تغیرات اور ایک جماعت کا دوسرے سے تعلق تجارت کا تجارت سے پیشے کا پیشے سے اور سوسائٹی کے مختلف مدارج آپس میں گزشتہ سالوں میں بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے گہرے اثرات کا پورا پورا اندازہ نہیں کیا گیا اور نہ ہماری تعلیم کے سلسلہ نے اس سخت زمانہ کی بڑھتی ہوئی خواہشوں اور ضروریات کا ساتھ دیا ہے،

ان سب سے بڑھ کر سیاسی فضا میں بڑی بھاری تبدیلیاں ہوئی ہیں، ہمارا جدید نظام حکومت ہماری اپنی ضروریات کی وجہ سے وجود میں نہیں آیا بلکہ بہت سی متضاد طاقتیں اس پیچیدہ طرز حکومت کے قائم ہونے کا باعث ہوئیں، اپنا راستہ طے کرنے میں ہم کو بہت سی پیچیدہ لہروں سے گزرنا ہوگا اور جب ہم اُن میں پھنسے ہوئے ہوں گے تو نہ ان کی تشریح کر سکیں گے اور نہ ضبط میں لا سکیں گے،

ہمارا فرض ہے کہ نہایت صبر و سکون کے ساتھ ان سب اسباب کا تجزیہ کریں اور

متفقہ طور پر ایک ایسے نظام کی تشکیل کریں اور اس میں وہ روح پھونکیں جو ہماری ضروریات کے بحیثیت مسلمان اور ہندوستانی ہونے کے عین مطابق ہو،

تنظیم کے متعلق یہ عرض ہے کہ بہتر ہوگا اگر ہماری کانفرنس ان ہمعصر اداروں کی اطلاعات جمع کرے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کام کر رہے ہیں یعنی ان اداروں میں طلباء کی تعداد، نصاب، مروجہ تعلیمی تجربات اور ان مشکلات کے متعلق جو درپیش ہوں بلکہ حل ہو گئی ہوں، خبریں وصول کرے، ایسے ریکارڈ (دفتر اطلاعات) کی بناء پر یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ مختلف ادارہائے متعلقہ میں دوستانہ سمجھوتہ اور باہمی امداد پیدا کر سکیں اور قائم بھی رکھ سکیں، اگر انٹر یونیورسٹی بورڈ کی مانند ہمارے عام اجلاس ممکن نہ ہوں تو دوستانہ خط وکتابت سے اتنا تو ہو سکتا ہے کہ اس کانفرنس کے وجود سے یہ کام لیں کہ تعلیمی کوشش باہم متفقہ ہو اور ضرورتیں جو درپیش ہوں ایک مرکز پر لائی جا سکیں،

بغیر کسی دخل درمعقولات کے صرف دوستانہ طریقہ ہی سے اطلاعات کے وصول کرنے اور بہم پہنچانے سے کانفرنس ان خامیوں اور کمیوں کو دکھا سکتی ہے جن کا پر کرنا ضروری ہو، یہ ادارہ کسی تجربہ کے نتائج کو جو ایک مقام پر کیا گیا ہو دوسرے مقام پر فائدہ اٹھانیکے لئے بہم پہنچا سکتا ہے اگر ایسے ریکارڈ کی مسلسل موجودگی اور سروے ممکن ہو تو ہر ایک یونٹ (حصہ) دوسرے سے بذریعہ دوستانہ رشک قوت حاصل کرے گا، اگرچہ ہمارا شعبہ زیادہ تر یونیورسٹی کی تعلیم پر غور کرنے کے لئے مخصوص ہے لیکن اس قدر سمجھ لینا چاہئے کہ یہ رائے تمام طریقہ تعلیم پر عائد ہو سکتی ہے، تعلیم کے مختلف اقسام اور مدارج نیز فنی تجاویز متعلقہ دستکاری، صنعتی، زراعتی اور سائنس کی تعلیم پر جو عملی طور پر کارآمد ہو سکے غور کرنا چاہئے، اسلامی علوم اور مشرقی تعلیم پر بھی حسب حیثیت توجہ دینا چاہئے، لیکن ہم کو اپنی توجہ محض تنظیم تک ہی محدود نہ رکھنی چاہئے، بلکہ کارکن لوگوں پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے، ہم کو زمانہ ماقبل کے مادی سماجی اور ذہنی حالات پر بھی نظر ڈالنا ہوگی اور طلباء کے نظریوں پر بھی خواہ انفرادی ہوں یا جماعتی، ان کی صحت اور جسمانی نشوونما مع ان مواقع کے جو ان کو مختلف اداروں یا صوبجات کے طلباء سے باہمی میل جول کے لئے میسر آ سکتے ہوں، غور کرنا ہوگا، اور طلباء کی آئندہ ملازمت اور کاروبار کے وسائل و ذرائع مطالعہ کرنا ضروری

ہے اور ان طریقوں پر غور کرنا ہوگا جن سے طلباء کو تعلیم کے معاملہ میں کورانہ تقلید سے بچا سکیں اور ہم کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پرائیویٹ کالجوں یا دیگر اداروں کے متعلمین کے لئے آئندہ کی ترقی کی راہیں اور سامان کیا کیا ہیں اور مجلس منتظمہ سے ان کے تعلقات کیسے ہیں' ان تمام امور میں ہم کو اپنے قومی اداروں نیز ہمسایہ قوموں اور سرکاری اداروں میں بھی موازنہ کرنا ہوگا' قومی اور شہری خدمت ایک مضمون ہے جو بعض اوقات اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کرلیا جاتا ہے' لیکن میری رائے میں ان کا مطالعہ الگ تنہائی میں اور کاروباری زندگی میں زیادہ مفید اور بااثر ہوسکتا ہے' اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ان مضامین کے اصولوں کا مطالعہ ہی بند کردینا چاہئے بلکہ برعکس اس کے یہ تعلیم ہمارے نوجوانوں کی توجہ کو ہماری قومی زندگی کی بڑے بڑے کاموں کی طرف مائل کرنے میں بہت مدد دے سکے گی' موجودہ طرز تعلیم یعنی طریقۂ تعلیم مطالب اور اساتذہ کی قابلیت سے مجھ کو سخت مایوسی ہوئی ہے' ہم کو چاہیئے کہ ان سب نقائص کو دور کریں لیکن اس سوال کے علمی پہلو پر ہم کو خاص توجہ دینا چاہئے' کیونکہ ہماری عام اور مذہبی زندگی میں اس تعلیم کو خاص درجہ حاصل ہے'

آج کل مہذب ممالک میں جو بڑا سوال انسانوں کے بڑے طبقہ کو پریشان کررہا ہے وہ انفرادی ضرورتوں کا قومی ضرورتوں سے مقابلہ ہے اور ان میں مناسب توازن کا قائم کرنا ہے' رائے کی ایک لہر ہے جو سوسائٹی کو اس قدر بے جا اہمیت دے دیتی ہے کہ افراد کو اس پر قربان کردیا جاتا ہے یہ حالت کمونزم اور اشتراکیت وغیرہ میں ہے لیکن دوسری طرف خیالات کی ایک اور رو ہے جو انفرادیت پر اس قدر زور دیتی ہے کہ سوسائٹی کی ضروریات اور مطالبے پس پشت ڈال دئے جاتے ہیں' میگنا چارٹا (فرمان آزادی انگلستان) سے لیکر انیسویں صدی کے وسط تک تاریخ برطانیہ اسی انفرادیت کے اصول پر قائم رہی اور اس کو ہمیشہ انفرادی آزادی کو ریاست کے مقابلہ میں قائم رکھنے پر اصرار رہا' امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ نے اس خیال کو لیا اور کئی درجے آگے بڑھ گئے یہاں تک کہ پریزیڈنٹ روزولٹ کا زمانہ آگیا'

خوش قسمتی سے اسلام نے ان دونوں انتہائی درجوں کے بیچ میں ایک معتدل مسلک

قائم کر دیا ہے، ہم کو تعلیم دی گئی ہے کہ ایک واحد روح خدا کی نظر میں بہت قیمتی ہے، اس کے قوائے دماغی قابلیت اور اس کی ہستی کے منزل مقصود تک پہنچنے کے مواقع میں ہر طرح کی امداد بھی پہنچانا چاہیئے، لیکن سوسائٹی کے بھی کچھ حقوق ہیں جن کو انفرادی مفاد پر ترجیح دینا چاہیئے خصوصاً بلحاظ جائداد اور قانون وراثت کے۔

اس وقت موقع نہیں کہ اسلامی تعلیم کے پہلو پر یہاں مفصل بحث کی جائے، میں نے اس کا ذکر صرف اس لئے کیا ہے کہ یہ امر تعلیم کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اور دنیا بھر کے بڑے بڑے سیاسی مسئلے اسی جگہ پر آ کر ٹکراتے ہیں، ہماری تعلیم کا توازن ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر فرد واحد اپنا مناسب حصہ حاصل کرے اور سوسائٹی اور برادری کو بھی قوت دے جو معاشرتی اور سیاسی حوادث کے ہجوم میں ایک دوسرے کا ساتھ دے سکیں اور ہر اس برائی کی طاقتوں کا متفقہ ہمت سے مقابلہ کر سکیں جو اس کے خلاف جمع ہو سکتی ہیں، ہماری سوسائٹی کوئی محدود گروہ نہیں اور نہ ہمارا تصور ریاست اس تصور کے متضاد ہے جو تمام بنی نوع انسان کو برادری کا ایک واحد حلقہ خیال کرتا ہے، جس طرح ہم ہر ایک فرد واحد کے حقوق کو ریاست کے بالمقابل جائز سمجھتے ہیں اسی طرح ریاست کے حقوق کو ریاستوں کے اجتماع کے مقابلہ میں بھی جائز تسلیم کرتے ہیں اور اس کے برعکس کو بھی۔

ہماری تعلیم کا نصاب ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر فرد واحد کی اعلیٰ ضروریات کو پورا کر سکے اور اس کو ایک بیش قیمت فرد سمجھے، جس کی زندگی محض اس کی ذات ہی کی وجہ سے قیمتی و ضروری ہو نہ کہ محض سوسائٹی کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے۔

جوں جوں ہم اس فرد کو خود اس کے گروہ کا ایک کارآمد اور وفادار ممبر بنانے کی کوشش کریں گے، ہم اس گروہ کے حلقہ کو بھی وسیع کرتے جائیں گے۔

خاندان ایک پہلا گروہ ہے، خاندان کی زندگی ہماری بیداری کا قیمتی اور قدرتی وسیلہ ہے۔

دوسرا گروہ گاؤں، شہر یا برادری ہو سکتا ہے لیکن انسان کی توجہ اور رغبت ان گروہوں تک ہی محدود نہ ہونا چاہیئے، بلکہ اس کی نظر اس کے ملک یا اس کی قوم تک پہنچنی

چاہیئے، لیکن اس کی تعلیم اس کی دل چسپی کو ایک تنگ قومیت تک ہی محدود نہ کرے بلکہ اس کو بڑے بڑے گروہوں تک پھیلنا چاہیئے و حتیٰ کہ تمام بنی نوع انسان کو ایک برادری سمجھے۔

اگر ہم اپنی تعلیم کی بنیاد ان خیالات پر قائم کر سکیں تو ہماری بہت سی مشکلات اور وہ تکالیف جو ہمسایہ قوموں سے پیش آتی رہتی ہیں حل ہو جائیں گی، مزید براں ہم اس قابل ہو جائینگے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک وسعت نظری کا راستہ دکھا سکیں گے، اس طرح ہم کو جدید و قدیم، اور پرانی روایات اور نئی تحقیقات اور ماضی و مستقبل میں صحیح توازن قائم کر دینا چاہیئے، ہم کو اپنی تعلیم اور زندگی میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس زندگی کی واجبی ضروریات اور اگلی دنیا کے خیالی نظریئے میں صحیح حد فاصل کون سی ہے، جو چیز ایک انتہا تک پہنچ جاتی ہے وہ بہت تنگ، دھندلی اور کثیف ہو جاتی ہے۔

آخر الامر ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم کا انحصار ماحول پر بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ باقاعدہ اور براہ راست درس و تدریس پر، اعلیٰ تعلیم جو سرداری کی روایات قائم کرتی ہے وہ اردگرد کے اثرات کی وجہ سے زیادہ لطیف حاصل ہوتی ہے بہ نسبت درس کے کمرے اور کھیلنے کے میدانوں کے، ہمارے بزرگوں کی روزمرہ کی روش اور مثال جو وہ قائم کرتے ہیں ہمارے لئے ضروری اور بیش قیمت ہیں، ہم لوگ جو اس زمانہ میں اپنی منزل حیات طے کر رہے ہیں دانستہ یا نادانستہ بغیر محسوس کئے ہوئے روزانہ ایک غلط یا صحیح تعلیم دے رہے ہیں ہمارے نوجوانوں کی دماغی حالت درست ہے لیکن وہ متضاد آوازوں سے گھبرا جاتے ہیں ظاہری اور نرم اصول ان کو غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں، جوانوں اور بوڑھوں میں ایک نفاق کی صورت پیدا ہو رہی ہے، ہمارے بزرگ خود آپس میں پھٹے ہوئے ہیں بعض اوقات شکایت بھی کرتے ہیں کہ نوجوان ان کا راستہ نہیں اختیار کرتے، وجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کو صحیح راستہ ملتا نہیں جو کسی متفقہ آواز سے بتایا گیا ہو، اور جو دلائل سے قائل کرے نہ کہ تحکم آمیز لہجہ کسی روش پر چلنے کے لئے مجبور کرے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ طلباء خود غرض نہ ہوں باہم متحد اور سچے ہو کر رہیں تو لازم ہے کہ ہم ان اوصاف کو اپنے روزانہ کی روش سے دکھلائیں کیونکہ یہ امور کسی جگہ اتنے ضروری نہیں جتنے کہ ہمارے اساتذہ اور طلباء کی تعلیم میں۔

خطبۂ صدارت

اردو پریس کانفرنس

مولوی بشیر الدین صاحب
اڈیٹر البشیر و منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی "پنجاہ سالہ جوبلی" کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا، وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر شعبہ کا ایک علیحدہ صدر اور سکرٹری تھا۔

من جملہ ان شعبوں کے ایک شعبہ "اردو پریس کانفرنس" تھا، جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر اردو اخبار نویس کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اس شعبہ کا "پہلا اجلاس" ۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۸ بجے شب آسمان منزل میں زیر صدارت خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر اخبار البشیر اٹاوہ منعقد ہوا، اور دوسرا ۲۸ مارچ کو ۹ بجے صبح زیر صدارت منشی دیا نرائن نگم صاحب بی اے اڈیٹر رسالہ زمانہ و اخبار آزاد کانپور منعقد ہوا۔

اس شعبہ کے سکرٹری مولوی محمد اکرام اللہ خاں ندوی اڈیٹر اخبار کانفرنس گزٹ اور مولوی نظام الدین حسین نظامی صاحب اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں تھے۔ دوسرے جلسہ میں ایک رزولیوشن کے ذریعہ سے "اردو پریس ایسوسی ایشن" کے نام سے یہ شعبہ ایک مستقل انجمن کی صورت میں قائم کر دیا گیا۔

ذیل میں اس شعبہ کے پہلے اجلاس کے صدر مولوی بشیر الدین صاحب کا خطبہ شائع کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ صدارت اُردو پریس کانفرنس

از

مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر و منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

محترم رہنمایانِ قوم!

اس جلسہ کا صدر بنا کر آپ نے جو عزت افزائی میری فرمائی ہی، میں اس کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن مجھ کو معاف فرمائے اگر میں یہ عرض کروں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے اہم کام اور ذمہ داری کے منصب پر مجھ جیسے پرانے دقیانوسی زمانہ کے شخص کو جس کو نہ زمانۂ موجودہ کی تعلیم حاصل ہوئی ہے! اور نہ وہ اس ترقی کی رفتار سے جو موجودہ زمانہ میں پریس کو ہوئی ہی واقف ہے صدر کیوں منتخب کیا ہے۔ حالانکہ خدا کے فضل و کرم سے ہماری برادری میں بہت سے "گریجویٹ" بھی ہیں اور مشرقی علوم کے عالم و فاضل بھی۔ ان میں علم نفسیات کے ماہر بھی ہیں جو اس امر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ زمانہ کے مطابق کس طرح اخبار کو ہر دلعزیز اور قوم و وطن کے واسطے مفید بنایا جا سکتا ہی۔ وہ نوجوان ہیں ان کے حوصلے اور اُمنگیں بڑھی ہوئی ہیں اور ایک اخبار کو مفید و پُر از معلومات بنانے کے لئے جس قدر سخت محنت کی ضرورت ایک اڈیٹر کو ہوتی ہے خدا کے فضل سے اس محنت کے برداشت کرنے کی قوت اور طاقت بھی ان میں موجود ہے۔ میں ایسی قابل ہستیوں کے مقابلہ میں ایک اسی برس کا بڈھا ہوں جس کے منہ میں نہ دانت ہیں نہ پیٹ میں آنت۔ جس

کی بصارت اور سماعت برائے نام باقی رہ گئی ہو اور خرابی صحت کی وجہ سے طاقت جواب دے چکی ہو۔ اور جو اسفل السافلین کے درجہ کو پہنچ چکا ہو۔

آپ حضرات واقف ہیں کہ عمر کے ساتھ تمام قویٰ میں جس طرح بجائے ترقی کے اضمحلال شروع ہو جاتا ہے اسی طرح دماغ کی قوتیں بجائے ترقی کرنے کے گھٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور نئے واقعات کو قبول کرنے اور ان سے نتیجہ نکالنے کی قوت و صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ میں بھی اس انسانی فطرت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ میں حیران ہوں کہ آپ صاحبوں نے جو میری حالت سے واقف ہیں اس قدر ذمہ داری کا بوجھ میرے کاندھو پر کیوں ڈالا ہے؟ جہاں تک میں غور کرتا ہوں اس کے صرف تین وجوہ معلوم ہوتے ہیں

اوّل یہ کہ پہلے زمانہ میں ہندوستان کی بہت سی برادریوں میں یہ رسم جاری تھی کہ بارات والے جب بارات لے کر جاتے تھے تو دلہن کے گھر جا کر ایسی نت نئی فرمائشیں کرتے تھے جس کو پورا کرنا ان کے امکان سے باہر سمجھتے تھے، اور اس طرح دلہن والوں کو ذلیل و شرمندہ کرنے کے لئے مختلف تجویزیں سوچتے تھے۔ اسی طرح دلہن والے بارات والوں کو شرمندہ اور پریشان کرنے کے لئے مختلف قسم کے نئے نئے مطالبات پیش کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک شادی کے موقع پر دلہن والوں نے دولہا والوں کو یہ پیام بھیجا کہ بارات اس شرط پر آئے کہ اس میں کوئی بڈھا آدمی نہ ہو۔ دلہن والوں کا جب یہ پیام پہنچا تو دولہا والے پریشان ہوئے کہ اگر یہ شرط قبول کی جائے تو کوئی اور نیا مطالبہ نہ پیش کر دیا جائے۔ اور جب کوئی تجربہ کار بڈھا موجود نہ ہوگا تو وہ شرط کیونکر پوری کی جائے گی۔ چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد یہ قرار پایا کہ ایک بڈھے کو ڈھول میں بند کر کے لے جانا چاہئے۔

چنانچہ ایک بڑے میاں ڈھول میں بند ہو کر بارات کے ساتھ گئے، جب بارات دلہن والوں کے گھر پہنچی تو انہوں نے یہ شرط کی کہ ہمارے یہاں کی یہ رسم ہے کہ جتنے آدمی بارات میں ہوں اتنے ہی بکرے وہ کھا جائیں۔ اس کے بعد شادی ہوگی۔ دلہن والو کے اس مطالبہ کو سن کر باراتی چکر میں آئے۔ آخر یہ تجویز ہوئی کہ بڑے میاں سے دریافت

کیا جائے کہ کیا تدبیر کی جائے۔ بڑے میاں نے مشورہ دیا کہ پہلے ایک بکرے کو ذبح کرکے اس کا گوشت پکا کر ایک ایک بوٹی کرکے کھالیں۔ اس کے بعد دوسرے بکرے کو ذبح کرکے گوشت پکا کر کھائیں اسی طرح تمام بکرے آسانی کے ساتھ کل باراتی کھالیں گے۔ چنانچہ بڑے میاں کے مشورہ پر عمل کیا گیا۔ اور دلہن والوں کا مطالبہ پورا کر دیا گیا۔ جب سے یہ مثل مشہور ہو گئی کہ بڈھے کو ڈھول میں بند کرکے بارات میں لے جاتے ہیں کہ وقت پر اس کے مشورہ سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

غالباً آپ حضرات نے بھی اسی خیال سے مجھ بڈھے کو یہاں بلایا ہے۔ لیکن اگر آپ مجھ کو صدر منتخب نہ کرتے اور مجھ کو بلا کر ایک کونے میں بٹھا دیتے اور وقت ضرورت مجھ سے مشورہ طلب کرتے تو آپ کا مقصد پورا ہو جاتا۔

دوسری وجہ میرے صدر منتخب کرنے کی غالباً یہ ہو کہ آج کل پرانے زمانے کے ٹوٹے پھوٹے برتن، پھٹے پرانے کپڑے، ٹوٹے پھوٹے نقش و نگار کے پتھر، گندہ اور ناکارہ ہتھیار بڑی تلاش و جستجو اور بیش قرار روپیہ صرف کرنے کے بعد جمع کرکے عجائب خانوں میں رکھے جاتے ہیں تاکہ زمانہ قدیم کے تمدن اور صنعت و دستکاری کا نمونہ لوگوں کی نظروں کے سامنے آجائے اور اس سے استفادہ کیا جائے شاید آپ نے اسی خیال سے نصف صدی پہلے کے ایک اڈیٹر کو نمایاں جگہ بٹھا دیا ہے تاکہ دنیا دیکھے کہ زمانہ قدیم میں اردو اخبار کے اڈیٹر ایسے گندہ ناتراش ہوا کرتے تھے۔

تیسری وجہ میرے صدر منتخب کرنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ ایشیا میں اور بالخصوص ہندوستان میں بڈھے آدمیوں کی عزت و توقیر کرنا داخل اخلاق تھا۔ ممکن ہے کہ آپ نے ہندوستان کی ایک قدیم رسم کے موافق اپنی برادری کے ایک بڈھے کی عزت فرمائی ہو۔

بہر حال میرے صدر منتخب کرنے کے جو کچھ بھی وجوہ ہوں میں آپ کی عزت افزائی کا کرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

موجودہ زمانہ میں اخبار کی ضرورت و اہمیت

حضرات۔ چونکہ میرا دلی عقیدہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر قوم و ملک کی ترقی اخبار کی ترقی پر منحصر ہے اور جس قوم کے اخباروں کی

مالی حالت زیادہ مستحکم ہوتی ہے، وہی ملک اور وہی قوم ترقی کرتی ہے اور جس قوم کے اخبار ادنیٰ درجہ کے ہوتے ہیں وہ قوم اور وہ ملک روز بروز پستی کی طرف گرتا چلا جاتا ہے، اس وجہ سے میں تمام قومی تعلیم گاہوں اور قومی اداروں کے وجود سے اردو اخبارات کے وجود کو زیادہ ضروری خیال کرتا ہوں۔ اور میری دلی تمنا اور آرزو ہے کہ اردو پریس مثل انگریزی اخبارات کے ترقی کرے، اور چونکہ یہ کانفرنس اردو پریس کی ترقی کے تدابیر پر غور کرنے کے لئے منعقد کی گئی ہے اس لئے باوجود خرابی صحت میں نے اس کانفرنس کی صدارت منظور کر لی ہے اگر اس کانفرنس سے کوئی ایسا نتیجہ نکلا جس سے کہ اردو پریس کا مرتبہ بلند ہو جائے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس جلسہ کی صدارت میرے لئے نجات کا ذریعہ ہوگی۔

اُردو اخبارات کا ابتدائی دور

حضرات۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور اخبار بینی کا شوق پیدا ہوا اس زمانہ میں اُردو کے بہت تھوڑے اخبار جاری تھے۔ اور گورنمنٹ کی خواہش تھی کہ اردو اخبار نویسی ترقی کرے، اس وجہ سے عام طور پر گورنمنٹ ہر ایک اردو اخبار کی بہت سی کاپیاں اسکولوں اور مختلف دفاتر کے لئے خریدتی تھی، دیسی ریاستوں میں بھی برٹش انڈیا کے اردو اخبارات خریدے جاتے تھے۔

اس زمانہ کے اخباروں کا یہ عمل تھا کہ عام لوگوں سے اور قیمت وصول کرتے تھے اور گورنمنٹ اور والیانِ ملک سے بڑی بڑی قیمتیں مقرر کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اگرچہ اخبارات کم تھے، لیکن اس طرح ان کو معقول آمدنی ہو جاتی تھی، سرکاری دفاتر میں جو فارم اور رجسٹر وغیرہ طبع ہوتے تھے وہ بھی لوکل پریس میں طبع ہوا کرتے تھے، اور ان کی معقول اجرت ملتی تھی، کیونکہ مقابلہ سخت نہ تھا۔

اردو کتابوں کی بھی بازار میں بہت زیادہ مانگ تھی، ہر شہر میں حتیٰ کہ قصبات میں بھی کتب فروشوں کی دکانیں موجود تھیں، بہت سے کتب فروش پھیری کر کے کتابیں فروخت کرتے تھے۔ ہندوؤں کے تیرتھ اور نہان اور میلوں کے موقع پر کتب فروش اپنی کتابیں فروخت کرنے کے لئے لے جاتے تھے۔ ان وجوہ سے مالکان پریس جو اخبار دں کے

ایڈیٹر بھی ہوتے تھے، ان کی مالی حالت بہت اچھی ہوتی تھی اور شہر میں نیز حکام کے نزدیک ان لوگوں کی بڑی عزت و توقیر ہوئی تھی۔ لیکن مالکان پریس کی اس خوشحالی کی زندگی کو دیکھ کر چونکہ بہت سے لوگوں نے اخبار جاری کر دیئے اس لئے گورنمنٹ نے اخبارات کی خریداری بند کر دی۔ یہاں تک کہ گورنمنٹ رپورٹر کے پاس جو اخبار بھیجے جاتے تھے ان کی قیمت ملنا بھی بند ہو گئی۔ سرکاری دفاتر کی چھپائی کا کام گورنمنٹ پریس میں ہونے لگا۔ اسی وجہ سے اخباروں کی مالی حالت روز بروز خراب ہونی شروع ہوئی۔ لیکن یہ غنیمت ہوا کہ اخبار بینی کا مذاق لوگوں میں پیدا ہونا شروع ہو گیا جس کی وجہ سے اخباروں کی مالی حالت پہلے سے اچھی تو نہ رہی۔ لیکن بہت خراب بھی نہ ہوئی۔

اردو اخبارات کا مقابلہ پہلے زمانہ میں پریس کے لئے کوئی مخصوص قانون نہ تھا۔ اس زمانہ میں ازالہ حیثیت عرفی کے دعوے دائر ہو جاتے تھے، جب کسی اخبار پر دعویٰ دائر ہوتا تھا تو اس کے خریدار بڑھ جاتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ اخبار مختلف سخت گیر قوانین کے شکنجہ میں کسے جانے لگے۔ پہلے زمانہ میں انگریزی پڑھے لوگ کم تھے، اور ہر صوبہ میں کسی نہ کسی انگریز یا انگریزی کمیٹی کے انتظام سے ایک اخبار نکلتا تھا جس کی قیمت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اور اردو ہندی کا جھگڑا بھی پیدا نہ ہوا تھا، اور نہ کوئی اخبار ہندی کا شائع ہوتا تھا اس لئے جن لوگوں کو اخبار بینی کا شوق ہوتا وہ اردو اخبار خریدنے پر مجبور تھے۔ ۱۸۷۷ء کی جنگ ٹرکی کے زمانہ سے جب اردو اخبار بینی کا مذاق بہت زیادہ بڑھ گیا، تو بہت سے دو ورقی روزانہ اخبار جاری ہوئے یہ شوق چونکہ عارضی تھا، اس وجہ سے جنگ ختم ہونے کے بعد وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو روزانہ اخبار جاری ہوئے تھے وہ بند ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اخبار پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، لیکن آج کل کی طرح واقعات عالم اس قدر جلد جلد تبدیل نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے ہفتہ وار اخبار بھی اس زمانہ کے اخبار پڑھنے والوں کا شوق پورا کرنے کے لئے کافی تھے، اس کے بعد انگریزی تعلیم یافتہ جماعت ملک میں بڑھنے لگی، اور ہر صوبہ میں انگریزی کے کم قیمت روزانہ اخبار نکلنا شروع ہوئے۔ لہٰذا لوگوں نے بجائے اردو اخبار کے

انگریزی اخبارات خریدنا شروع کئے۔ اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہونے کے بعد ملک میں ہندی کے اخبار بھی نکلنا شروع ہوگئے، اس وجہ سے ہندو اخبار بین پبلک نے بجائے اردو اخبارات کے ہندی اخبارات کی خریداری شروع کردی۔

فرقہ وارانہ اختلافات کا اثر اُردو اخبارات پر

چونکہ بدقسمتی سے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات روز بروز خراب ہوتے جارہے ہیں، اس وجہ سے ہندو اصحاب ان اخبارات کو جو مسلمان نکالتے ہیں نہیں پڑھتے اور مسلمان اصحاب ان اخبارات کو جو ہندی میں شائع ہوتے ہیں عام طور پر مطالعہ نہیں کرتے، نتیجہ یہ ہے کہ اردو اخبارات کی اشاعت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، اردو اخبارات کی مالی کمزوری کا سبب یہ بھی ہے کہ اکثر مالکانِ اخبار وہی مالکان پریس ہوتے تھے، جو اردو کی کتابیں چھاپتے تھے، اور کتابوں کی تجارت سے جو منافع ہوتا تھا اس کا بڑا حصہ اخبار کی ترقی میں صرف کرتے تھے، اب کچھ عرصہ سے اُردو کے خواندہ اشخاص کی تعداد کم ہورہی ہے اس لئے اردو کتابوں کی نکاسی کے لئے اب کوئی بازار نہیں رہا۔

چنانچہ میلوں اور نمائشوں میں ہندی کے کتب فروشوں کی متعدد دکانیں ہوتی ہیں، لیکن کسی اردو کتب فروش کی دکان نہیں دکھائی دیتی، چھوٹے اور اوسط درجہ کے شہروں میں اردو کتب فروشوں کی دکانیں ختم ہوچکی ہیں، لکھنؤ، دہلی اور کانپور ایک زمانہ میں اردو کتابوں کے دساور تھے وہاں بھی سوائے ایک دو دکانوں کے کوئی دکان نظر نہیں آتی۔

بدقسمتی سے اب اردو ہندی کا سوال ایک قومی سوال بن گیا ہے، اور مسلمان جو اردو کی زبانی ہمدردی کا بہت کچھ اظہار کرتے ہیں، ان میں انگریزی خواں اصحاب کی یہ حالت ہے کہ وہ نہ اردو اخبار پڑھتے ہیں نہ اُردو کی کتابیں، میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے کہ جب سرسید مرحوم، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولانا محمد حسین آزاد، اور مولوی نذیر احمد وغیرہ مستند اور چوٹی کے لیڈر نہایت شوق کے

ساتھ اردو اخبارات کو خرید کرتے تھے، اور نہایت پابندی کے ساتھ ان کو پڑھتے تھے، آج مسلمان لیڈروں کی یہ حالت ہے کہ وہ اردو اخبار خریدنا یا پڑھنا اپنی ذلت خیال کرتے ہیں

اُردو اخبارات کی عمر اور بے مائیگی

ان تمام حالات اور وجوہ کی بناء پر اردو پریس کی مالی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے اُردو اخبار جو نکلے وہ بند ہو چکے اور جو نکل رہے ہیں کوئی امید نہیں کہ وہ زیادہ عمر پائیں، چنانچہ پرانے زمانہ کے اخباروں میں صرف اودھ اخبار ایسا ہے جس کی عمر ۸۱ سال کی ہوئی ہے، اور یہ بھی اس وجہ سے کہ اس کے بانی منشی نولکشور آنجہانی نے اپنی وفات کے وقت کافی سرمایہ چھوڑا تھا، اور خوشی کی بات ہے کہ ان کے قائم مقاموں نے آج تک اس اخبار کو جاری رکھا ہے۔

دوسرا اخبار دبدبۂ سکندری ہے جس کی عمر ۰ سال کی ہے، یہ اخبار زیادہ تر ریاست رامپور اور دوسری دیسی ریاستوں اور امراء کی فیاضی اور امداد سے جاری ہے، جہاں تک مجھ کو علم ہے اور کوئی اردو اخبار ایسا نہیں ہے جو پچاس سال سے زیادہ کا ہو، واقعات یہ بتاتے ہیں کہ جس طرح انسانوں کی عمر فانی ہوتی ہے اسی طرح انسانی عمر کے اوسط سے کم اُردو اخباروں کی عمر ہوتی ہے، اس زمانہ میں اخبارات کی زندگی کا زیادہ تر مدار اشتہارات کی آمدنی پر ہوتا ہے، لیکن اردو اخباروں کی اشاعت چونکہ محدود ہوتی ہے اس وجہ سے اردو اخبارات میں اشتہارات کم ہوتے ہیں۔ آج کل واقعات چونکہ جلد جلد تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور خبر رساں ایجنسیاں زیادہ ہوگئی ہیں، لہذا جن لوگوں کو اخبار بینی کا شوق ہوتا ہے وہ روزانہ اخبار پڑھتے ہیں، لیکن اچھے روزانہ اخبار کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور چونکہ سرمایہ دار انفرادی طور پر یا مشترکہ سرمایہ سے اردو اخباروں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اس کام میں روپیہ نہیں لگاتے اس وجہ سے اردو کے روزانہ اخبار بہت کم ہیں، اور جو ہیں وہ کمی سرمایہ کی وجہ سے ریوٹر اور ایسوشی ایٹیڈ پریس سے براہ راست خبریں نہیں منگوا سکتے اور روزانہ اچھے اخبار کی تیاری کے واسطے جس قدر اسٹاف کی ضرورت ہوتی ہے نہیں رکھ سکتے ہیں، اسی وجہ سے اُردو کے روزانہ

اخبارات میں خبریں کئی روز کے بعد شائع ہوتی ہیں، اور انگریزی خواں حضرات کو جو انگریزی کے اخبارات پڑھتے ہیں کوئی دلچسپی اُردو کے روزانہ اخبارات سے نہیں ہوتی۔

بوجہ کمی سرمایہ کے انگریزی اخبارات کے مقابلہ میں اردو اخبارات کا حجم بھی کم ہوتا ہی اس کے علاوہ اردو کے جو اچھے روزانہ اخبار ہیں ان سے پے در پے ضمانتیں طلب ہوتی ہیں، اس وجہ سے وہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتے ہیں، اور اکثر بند ہو جاتے ہیں۔

حال میں گورنمنٹ کے "محکمہ ڈاک" کی طرف سے ایک ایسی پابندی عائد کی گئی ہے جس کے عملدرآمد ہونے پر اندیشہ ہے کہ بہت سے اُردو اخبارات کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا وہ حکم یہ ہی کہ اخبارات کو جن کی رعایتی شرح محصول پر روانہ ہونے کے لئے رجسٹری کی جاتی ہے مجبور کیا گیا ہے کہ وہ تاریخ مقررہ پر پوسٹ ہوا کریں، اور ان کی ایک کاپی پوسٹ ماسٹر جنرل حلقہ کے پاس بلا قیمت بھیجی جائے، پہلے تو ان کو تنبیہ کی جائیگی اگر متواتر ایسا ہوگا تو ان سے یہ رعایت واپس لے لی جائے گی، اس حکم کا زیادہ اثر اردو اخبارات پر پڑے گا، کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اُردو اخبارات کے پاس نہ طباعت کا کافی اسٹاف ہوتا ہی نہ ادارت کا کہ دوسرے عملہ سے کام لے کر ہرج مرج کا مقابلہ کیا جا سکے، یہ سب مشکلات اس وقت تک باقی رہیں گی جب تک انگریزی اور ہندی کے اخبارات کی طرح اردو اخبارات مشترکہ سرمایہ سے جاری نہیں کئے جائیں گے۔

اُردو پریس کو ترقی دینے کی ضرورت

مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں کو اکثر یہ خیال پیدا ہوتا ہی کہ مسلمانوں کی عام آواز انگریزی حکام کے کانوں تک پہنچانے کے لئے اچھے روزانہ انگریزی اخبار کی ضرورت ہے، لیکن افسوس ہے کہ سیاسی لیڈروں نے اب تک اس بات کو نہیں سمجھا کہ انگریزوں کے کان تک آواز پہنچانے سے زیادہ ضروری یہ ہی کہ قوم کو بیدار کیا جائے، اور قوم کو بیدار کرنا اور ان میں صحیح احساس پیدا کرنا صرف اردو اخبار کر سکتے ہیں، ملک میں جو سیاسی بیداری آج دیکھنے میں آتی ہی اور کانگریس نے جو وقعت آج حاصل کی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہی کہ مسٹر تلک آنجہانی جو کانگریس کو پُرانے ڈھانچے سے نکال کر نئی جدوجہد کے لئے آمادہ کرکے

کے بانی تھے انہوں نے بجائے انگریزی میں اخبار نکالنے کے مرہٹی زبان میں اخبار نکالا۔ ان کا مقولہ تھا کہ گورنمنٹ کے کان تک آواز پہنچانے سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ قوم میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے، اور گورنمنٹ خود مجبور ہوگی کہ وہ ہمارے اخبارات کا ترجمہ کرائے کاش مسلمان رہنما اس نکتہ کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں، اور جس قوت کا کانگرس نے موجودہ الیکشن میں اظہار کیا ہے اس سے سبق حاصل کریں، اور مسلمانوں کے جو ادارے خواہ سیاسی ہوں یا تعلیمی ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک وہ اردو پریس کو مضبوط اور قوی نہ بنائیں گے ان کے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی، جو لوگ مسلم یونیورسٹی اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخ سے واقف ہیں وہ اس واقعہ سے انکار نہیں کر سکتے کہ قوم میں جو گرویدگی اور دلچسپی ان دونوں اداروں سے پیدا ہوئی اس کا باعث صرف اردو پریس تھا، لیکن جب سے ان اردو اخباروں کی حالت خراب ہوئی۔ اس وقت سے قوم کو ان دونوں اداروں سے نہ وہ شغف باقی رہا اور نہ وہ دلچسپی۔

قومی ادارے اور اخبارات

مجھ کو وہ زمانہ یاد ہے کہ جب انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی ہے اس کے بانیوں نے کانگرس کو ہر دلعزیز بنانے اور اس کا پروپگنڈا کرنے کے لئے پہلا کام یہ کیا تھا کہ مختلف صوبوں کے مختلف زبانوں کے اخبارات کے کالم اسی طرح خرید لئے تھے جس طرح کہ تجارتی کمپنیاں اخبارات کے کالم خرید لیتی ہیں اسی کا نتیجہ تھا کہ کانگرس کی آواز بہت جلد تمام ملک میں پھیل گئی، اور بہت ہی تھوڑے زمانہ میں کانگرس کے اغراض و مقاصد ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے، اور جن اخباروں نے کانگرس کے اغراض و مقاصد کی اشاعت اپنے ذمہ لی تھی، آج ان اخباروں کی مالی حالت زیادہ بہتر اور زیادہ مضبوط ہے۔

برخلاف اس کے علی گڑھ کی تحریک، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد کی حمایت اور پروپگنڈا کرنے کا کام جن اردو اخباروں نے اپنے ذمہ لیا تھا آج اُن اخباروں کی مالی حالت اچھی نہیں ہے، غرض جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے میرا عقیدہ یہ ہے کہ جس قوم کے اخبارات کی مالی حالت خراب ہوتی ہے وہ قوم

روز بروز پستی کی طرف گرتی جاتی ہے۔ میرے اس خیال کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ مسلمان جو اردو کی حمایت کا زبانی دعویٰ کرتے ہیں، وہ روز بروز پستی کی جانب گرتے جاتے ہیں، ان میں ابتدائی تعلیم میں بجائے ترقی ہونے کے تنزل ہو رہا ہے۔ اور ان کی اقتصادی اور اخلاقی حالت گرتی چلی جاتی ہے۔

اُردو پریس کی کمزوریاں

حضرات! میں نے سطور بالا میں اردو اخبارات کی ترقی نہ کرنے کا تمام تر الزام قومی اداروں اور قومی لیڈروں کو دیا ہے حقیقت میں یہ ناانصافی ہوگی اگر میں اڈیٹروں کی کمزوریوں کے متعلق کچھ ظاہر نہ کروں، اس وجہ سے آپ مجھ کو معاف فرمائیں گے، اگر میں یہ عرض کروں کہ ہم کو خود اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے کہ ہم میں کیا کیا کمزوریاں ہیں اور کیا کیا نقائص ہیں میرے نزدیک اردو اخبارات کے مالکوں اور اڈیٹروں میں بڑا نقص یہ ہے کہ وہ کوآپریٹو اصول پر باہم مل جل کر کام نہیں کرتے اور ہر شخص جداگانہ امتیاز حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس وجہ سے جس نسبت سے اردو اخبارات کی تعداد میں ترقی ہوئی ہے اس نسبت سے اردو اخبارات پڑھنے والوں کی تعداد میں ترقی نہیں ہوئی۔

اگر وہ اصحاب جو اس وقت جُدا جُدا اپنے اخبارات نکال رہے ہیں، سب مل کر مشترکہ کمیٹی کے اصول پر کوئی اچھا اخبار نکالیں اور تقسیم عمل کے اصول پر اپنے اپنے کام تقسیم کرلیں اور منافع بھی تقسیم کرلیا کریں تو گو تعداد میں اخبار کم ہوجائیں گے لیکن جو اخبار ہوں گے وہ زیادہ اچھے اور بہتر حالت میں ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ابھی کچھ عرصہ تک میرے اس مشورہ پر عمل نہ ہوسکے گا کیونکہ ہم میں مشترکہ طریقہ سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔

لہٰذا میں اپنے بھائیوں کو نہایت دلسوزی کے ساتھ یہ مشورہ دیتا ہوں کہ ہر ایک اخبار کا اڈیٹر اپنے مذاق اور طبیعت کے موافق اپنے لئے ایک "مخصوص پالیسی" مقرر کرلے اور وہ اپنی پالیسی کے اندر رہ کر قوم و ملک کی خدمت کرے، مثلاً جن اصحاب کو "مذہب" کی ترقی و اشاعت کا خیال ہے وہ صرف اسی ایک مقصد کے لئے اپنے اخبار کے کالم وقف کردیں،

اور جن اصحاب کو مذہبی "مناظرہ" کا شوق ہو وہ اپنے اخبار کی پالیسی مناظرہ تک محدود رکھیں، جن کو "تعلیم" سے دلچسپی ہو وہ تعلیمی تحریکات پر اپنے اخبارات میں بحث کریں، جن صاحبوں کو "سیاسی معاملات" سے دلچسپی ہو وہ سوائے سیاسی معاملات کے دوسرے معاملات کو اپنے اخبار کے کالموں میں جگہ نہ دیں۔

اردو کے ہفتہ وار اخباروں کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ ہفتہ بھر کی خبروں میں سے کچھ خبریں بجنسہ ترجمہ یا نقل کر دیں ذرا محنت کر کے مختلف قسم کی خبروں کا خلاصہ مختصر طریق پر ایک جا جمع کر دیا کریں اور کوشش کریں کہ ان کے مختصر صفحوں میں ہفتہ بھر کے تمام واقعات آ جائیں۔

طلبہ کے لئے اخبار اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے اخبار زیادہ تعداد میں شائع ہوں جن کی زبان نہایت آسان اور ان میں جو واقعات درج کئے جائیں ان کا طریقۂ بیان بچوں کی سمجھ کے لائق ہو۔

سکنڈری اسکولوں کے طلباء کے اخبارات علیٰحدہ ہوں، جن کا معیار بچوں کے اخبار سے بلند ہو، اسی طرح یونیورسٹیوں اور کالجوں کے جو اخبار ہوں وہ زیادہ بلند پایہ ہوں۔

لڑکیوں کے اخبار اور رسالے اردو زبان میں بہت کم شائع ہوتے ہیں، اور جو کچھ ہیں ان میں واقعات عالم کی بہت کمی ہوتی ہے، ایسے اخبارات بھی اردو میں بہت ہی کم ہیں جو عوام اور مزدوری پیشہ جماعت کے لئے جاری کئے گئے ہوں۔ ضرورت ہے کہ اس طبقہ کو ابھارنے کے لئے عوام الناس کی ضروریات اور ان کے مذاق کے موافق زیادہ سے زیادہ اخبار جاری کئے جائیں۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اس طریق عمل سے اردو اخبارات کی اشاعت زیادہ ہو جائے گی اور عوام کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا، بجائے اس کے کہ ہم کسی ترقی یافتہ اخبار پر حاسدانہ نظر ڈالیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس کوشش اور تگ و دو میں مصروف ہو جائیں کہ عوام الناس کے مذاق کے مطابق ہم کس طرح اچھے سے اچھا اور سستے سے سستا اخبار نکال سکتے ہیں۔

اردو اخبارات کا افسوسناک طرز عمل حضرات! آپ مجھ کو معاف فرمائیں گے اگر میں

صاف الفاظ میں ظاہر کردوں کہ اردو کے بہت سے اخبار اپنے معاصرین کو بدنام کرنے اور ان کی ڈاڑھی نوچنے میں مصروف رہ کر خود اپنی وقعت اور اپنے اثر کو خراب کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ طریق عمل جس قدر جلد ترک کیا جائے اتنا ہی اردو اخباروں کی ترقی اور اثر کا باعث ہوگا۔ کسی ہمعصر کی رائے سے اگر کسی صاحب کو اختلاف ہو تو بغیر اظہار نام کے اس کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑا نقص اردو اخباروں میں عام طور پر ہے وہ یہ ہے کہ وہ اشخاص کی مدح اور ذم کے وقت اعتدال سے گزر جاتے ہیں مدح کے وقت اکثر اردو اخباروں کی تحریر میں خوشامد اور بھٹئی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اسی طرح جب اشخاص کی مذمت کی جاتی ہے، تو ان تحریروں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو اس شخص سے جس کی مذمت کی گئی ہے، کوئی ذاتی عداوت یا رنج ہے۔

صحیح طریقۂ کار میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ اگر کوئی اچھا کام کرے تو ضرور اُس کی تعریف کرنی چاہئے اور اگر کوئی بُرا کام کرے تو اُس کام کی مذمت کرنی چاہئے لیکن اشخاص کے اچھے اور بُرے کاموں کا ذکر بطور واقعات کے ہونا چاہئے" اگر کسی لیڈر کی رائے سے اختلاف ہو یا اتفاق تو واقعات کی تائید یا تردید واقعات سے کرنا چاہئے۔

قومی تعلیم گاہوں اور اداروں کے اندرونی معاملات اور انتظامات کے متعلق نکتہ چینی کرنے سے قومی تعلیم گاہوں اور تعلیمی اداروں کو اردو اخباروں کے اس طریق عمل سے بجائے نفع پہنچنے کے نقصان زیادہ پہنچتا ہے اور افسوس ہے کہ سوائے اردو اخبارات کے یہ نقص دوسری زبان کے اخباروں میں عموماً نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح سیاسی معاملات میں بہت سے اُردو اخبارات جوش میں آکر بعض وقت اعتدال سے گزر جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ گورنمنٹ کی کارروائیوں پر سنجیدگی کے ساتھ نکتہ چینی کریں اور پچھلی رپورٹوں اور کارروائیوں سے گورنمنٹ کی کارروائی کو غلط ثابت کریں جوشیلے اور مبالغہ آمیز الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُردو اخبارات قانونی شکنجہ میں آجاتے ہیں اور ان سے ضمانتیں طلب ہوتی ہیں، یا اُن کی ضمانتیں ضبط ہو جاتی ہیں، اسی طرح

گورنمنٹ اور اس کے حکام کی تعریف کرنے میں بہت سے اخبار اعتدال سے گزر جاتے ہیں جس کی وجہ سے آزادی پسند طبقہ میں اردو اخبار ذلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اردو اخباروں میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ بہت سے ایڈیٹر جو الفاظ استعمال کرتے ہیں اُن کے اصلی مفہوم و اثر سے وہ خود واقف نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ان کی وقعت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اُردو اخبارات پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ فرقہ وارانہ منافرت کو زیادہ ترقی دے رہے ہیں اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات جو روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں اس کا ذمہ دار اُردو اخباروں کو قرار دیا جاتا ہے اس اعتراض کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ نہ صرف اردو اخبارات بلکہ دوسری دیسی زبانوں کے اخبارات بھی اس الزام سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ ہندوستانیوں کے جو انگریزی اخبار شائع ہوتے ہیں وہ بھی اس نقص سے مستثنےٰ نظر نہیں آتے فرق جو کچھ ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اُردو اخباروں کے اڈیٹر عام طور پر زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے، اس وجہ سے اُن کے الفاظ زیادہ تر نامناسب ہوتے ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ قوم کی بدمذاقی کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ جو اخبار قوم کے بگڑے ہوئے مذاق کی پیروی کرتے ہیں اُن کی اشاعت کچھ بڑھ جاتی ہے لیکن اگر اس طریقہ کو ہمارے معاصرین ترک کر دیں تو اس سے اُن کو تھوڑا سا مالی نقصان اُٹھانا پڑے گا لیکن اس طریقہ کے ترک کرنے کی وجہ سے اخبارات کی وقعت بڑھ جائے گی اور یہ فائدہ بمقابلہ تھوڑے سے مالی نفع کے بہت زیادہ ہوگا۔

بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ قوموں کی ترقی بہت کچھ اخباروں کی پالیسی اور ان کی تحریروں پر منحصر ہے اس وجہ سے میں معاصرین کی خدمت میں یہ گزارش کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو وہ انتہائی کوشش کریں کہ اُن کی کسی تحریر سے قومی منافرت پیدا نہ ہو اور ہندوستان کی ترقی اور آزادی کی راہ میں اُن کا وجود رکاوٹ پیدا کرنے کا سبب نہ ہو۔

خصوصیت کے ساتھ میں اردو کے اسلامی اخباروں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے اکثر اردو اخبارات ایسے ہیں کہ وہ ہندو مسلم منافرت سے زیادہ

خود مسلمانوں کے باہمی فرقوں میں منافرت پیدا کرنے کا سبب ہوتے ہیں مجھ کو معاف فرمایا جائے اگر میں صاف الفاظ میں یہ بیان کروں کہ مسلمانوں میں منافرت پیدا کرنے کی پالیسی خود مسلمانوں کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔

اڈیٹروں کو وسعت معلومات کی ضرورت

اُردو اخبارات میں بہت سے اخبارات ایسے ہیں جن کے اڈیٹروں کو کتب بینی کا شوق نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت سے مضامین ایسے ہوتے ہیں جن سے پڑھنے والوں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اُردو اخباروں کے جو اڈیٹر انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اُن کے واسطے نہایت کثرت کے ساتھ انگریزی کتابیں ایسی موجود ہیں کہ اگر یہ اڈیٹر اُن کا مطالعہ کرتے رہیں تو اُن کے قلم سے اعلیٰ درجہ کے مضامین تحریر ہو سکتے ہیں۔ اردو اخبار کے جو اڈیٹر انگریزی اچھی طرح نہیں جانتے اُن کی معلومات میں ترقی کرنے کے لئے اُردو میں ہر قسم کی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جن کو فراہم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس وجہ سے ہر ایک پریس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اُس کے دفتر میں اردو کی ایک اچھی لائبریری موجود ہو۔

اُردو اخبارات کی ترقی کی تدابیر

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اُردو اخبارات کی کمی اشاعت کا سبب اردو خواندہ اشخاص کی کمی ہے، یہ کمی صرف اسی طرح سے پوری ہو سکتی ہے کہ تمام اُردو اخبارات متفقہ طور پر مسلسل اس امر پر زور دیں کہ ملک میں ابتدائی تعلیم جبریہ اور مفت جاری ہو، چونکہ کانگرس بھی اسی مسئلہ پر زور دے رہی ہے لہذا اس تحریک کو کامیاب بنانے کے واسطے یہ بہترین وقت ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس امر کی کوشش کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ اُردو اور ہندی کی تعلیم لازمی کی جائے کہ ہر اردو پڑھنے والا طالب علم ہندی بھی پڑھے اور ہر ہندی پڑھنے والا طالب علم اردو بھی پڑھے، اس طرح اردو ہندی کے جھگڑے میں بہت کمی ہو جائے گی! اور اُردو اخبار پڑھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔ میں تو یہ بھی مشورہ دوں گا کہ تم سب کو

متفقہ طور پر اس امر کی کوشش کرنی چاہئے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے طلباء کے پڑھنے کے لئے اُردو اخبار خرید کئے جائیں۔ اور طالب علموں کو شوق دلایا جائے کہ وہ پابندی کے ساتھ اخبار پڑھیں۔ اگر یہ طریقہ جاری ہو جائے تو اس سے اردو اخبارات کی اشاعت میں ترقی ہو جائے گی اور جو الزام آج کل کے طالب علموں پر نکمے اور بیکار ہونے کا لگایا جاتا ہے اس میں بہت کچھ کمی واقع ہو جائے گی اور ہندوستانی طالب علم بہترین دل و دماغ لیکر نکلیں گے۔

اردو اخبارات کی انجمن

حضرات آخر میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو اخبارات جو تمام دنیا کی اصلاح کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اور دوسروں کے کاموں پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ خود اپنی اصلاح کے لئے کسی انجمن کے بنانے سے اب تک قاصر رہے ہیں، پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ گنگا پرشاد آنجہانی ایڈیٹر اخبار ہندوستانی کے مکان پر لکھنؤ کے مقامی اُردو اخبارات کا ایک مختصر سا جلسہ ہوا تھا اس جلسہ میں شرکت کی مجھ کو بھی عزت حاصل ہوئی تھی لیکن میں افسوس کے ساتھ بیان کرتا ہوں کہ اس جلسہ کی کارروائی ختم ہونے کے بعد کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات میں اس ضرورت کے لئے مختلف مضامین شائع ہوئے جن کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ حال میں لکھنؤ اور لاہور وغیرہ میں پھر اسی قسم کی کوششیں ہو رہی ہیں ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر اُردو کانفرنس کا جلسہ بھی منعقد ہوا تھا اس جلسہ میں چند رزویوشن پاس ہوئے اور صاحب صدر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جلسہ ہمیشہ کے لئے برخاست ہو گیا۔ اب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر اردو پریس کا جلسہ پھر منعقد کیا گیا ہے مجھ کو خوف ہے کہ اس جلسہ کا بھی وہی حشر نہ ہو جو اس سے پہلے کا ہو چکا ہے۔ جبکہ اُردو اخبار خود اپنی حفاظت کا انتظام نہیں کر سکتے تو قوم کی شکایت فضول ہے۔

اُردو پریس کی مالی حالت اچھی ہوتی تو میں اُن سے اپیل کرتا کہ وہ سب مل کر ایک سرمایہ جمع کریں اور جب کسی اخبار سے ضمانت طلب ہو تو اس سرمایہ سے زرِ ضمانت

داخل کیا جائے۔ لیکن میں واقف ہوں کہ اردو پریس کی مالی حالت اس قدر خراب ہے کہ اگر وہ کوشش کریں تو بھی ضرورت کے لائق سرمایہ جمع نہیں کر سکتے لہذا ہم کو کم از کم یہ تو کرنا چاہئے کہ جب کسی اخبار سے ضمانت طلب ہو تو اُس کی قلمی ہمدردی کریں اور اپنے اخبار کے کالموں میں چندہ کی فہرست کھول دیں اور اس طرح وہ اپنے ناظرین سے چندہ عطا کرنے کی اپیل کریں، جو چندہ جمع ہو وہ اُس پریس کو بھیجدیا جایا کرے جس سے ضمانت طلب ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس طریق عمل سے زرضمانت کا روپیہ فراہم ہوسکتا ہے۔

حضرات ۔ آخر میں میں اس امر کی آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے محض اُردو پریس کی ترقی کے خیال سے بعض ناگوار واقعات کا اظہار کیا ہے وہ محض اس غرض سے کیا گیا ہے تاکہ اردو اخبارات کی حالت بہتر سے بہتر ہو جائے ۔ میری غرض کسی کی دل آزاری نہیں ہے۔

خطبۂ صدارت

اردو پریس کانفرنس

منشی دیا نرائن نگم صاحب بی اے

اڈیٹر رسالہ زمانہ و اخبار آزاد کان پور

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی "پنجاہ سالہ جوبلی" کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا، وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر شعبہ کا ایک علیحدہ صدر اور سکرٹری تھا۔

من جملہ ان شعبوں کے ایک شعبہ "**اردو پریس کانفرنس**" تھا، جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر اردو اخبار نویس کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اس شعبہ کا "پہلا اجلاس" ۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۸ بجے شب آسمان منزل میں زیر صدارت خان بہادر مولوی **بشیر الدین** صاحب اڈیٹر اخبار البشیر اٹاوہ منعقد ہوا، اور دوسرا ۲۸ مارچ کو ۹ بجے صبح زیر صدارت منشی دیا نرائن نگم صاحب بی۔ اے اڈیٹر رسالہ زمانہ و اخبار آزاد کانپور منعقد ہوا۔

اس شعبہ کے سکرٹری مولوی **محمد اکرام اللہ خاں** ندوی اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ اور مولوی **نظام الدین حسین** صاحب نظامی اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں تھے، دوسرے جلسہ میں ایک رزولیوشن کے ذریعہ سے "**اردو پریس ایسوسی ایشن**" کے نام سے یہ شعبہ ایک مستقل انجمن کی صورت میں قائم کر دیا گیا۔

ذیل میں اس شعبہ کے دوسرے اجلاس کے صدر منشی دیا نرائن نگم صاحب اڈیٹر رسالہ زمانہ کا خطبہ شائع کیا جاتا ہے۔

اُردو پریس کانفرنس علی گڑھ کا خطبۂ صدارت

از

منشی دیانرائن نگم صاحب بی اے اڈیٹر رسالہ "زمانہ" واخبار "آزاد" کانپور

مُعزّز ومحترم معاصرین! جوبلی سب کمیٹی کے حسب ارشاد میں آپ کی خدمت میں حاضر تو ہوگیا ہوں لیکن مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ اس اہم خدمت کا حق ادا ہونا جس پر آپ نے مجھے مامور فرمایا ہے بہت مشکل ہے۔ لیکن اپنی ناقابلیت کے باوجود میں اس خیال سے کہ بحالت موجودہ کسی اہل وطن کو اعلیٰ ادنیٰ کسی خدمت سے عذر کرنے کا موقع نہیں ہے اور اس اُمید پر کہ اس منصب کے فرائض ادا کرنے میں آپ حضرات کی فیاضانہ امداد اور برادرانہ اعانت شامل حال رہے گی۔ مجھے آپ کے تعمیل حکم سے انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ اس قدر افزائی کے لئے میں جوبلی کمیٹی اور آپ معاصرین کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اُمید کہ آپ میری کوتاہیوں کو نظر انداز فرما کر اس کانفرنس اور اس کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں امکانی امداد سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

جدید سیاسی دور — صاحبان! ہمارا ملک آج کل ایک نئے سیاسی دور سے گزر رہا ہے

جس کے آخری نتائج کا ابھی کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس سے ملکی ترقی اور قومی فلاح کی بہترین اُمیدیں ضرور وابستہ ہیں۔ تین ہی دن بعد یعنی یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے صوبجات کی گورنمنٹ میں اصولی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن سے نظم ونسق کی باگ ڈور بہت کچھ ہمارے منتخب قائم مقاموں کے ہاتھ میں آجائے گی اور گو نئے آئین سے کسی طبقے کی تشفی نہیں ہوئی ہے اور مقتدر مدبّران انگلستان نے اس معجون مرکب آئین حکومت کے ماتحت ہندوستانی وزیروں کے اختیارات محدود کرنے میں انسانی تدابیر کی حد تک کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔ تاہم نئے آئین میں بنیادی حیثیت سے سیاسی اقتدار کا مرکز قطعاً تبدیل ہو جائے گا اور مختلف صوبوں کی حکومت گورنز اور اُن کے ماتحت افسروں کے بجائے عوام ہند کے قائم مقاموں کے ہاتھ میں آجائے گی۔

برٹش ماہرین جہاں بانی کے تمام حزم و احتیاط کے باوجود بالآخر اس تبدیلی کا اثر بہت دور رس، دیرپا اور انقلابی ہوگا۔ متمدن دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ایک مرتبہ جب دفتری حکومت اور مطلق العنان و غیر ذمہ دار طرز گورنمنٹ میں جمہوری اصول کو دخل مل جاتا ہے پھر عوام کی سیاسی بیداری اور جمہور کے حقوق طلبی کی جتنی حدیں مقرر کی جاتی ہیں وہ سب کی سب بالآخر بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے میری نگاہ میں اس تغیر و تبدّل کی جو صوبوں کی گورنمنٹ میں ہو رہا ہے غیر معمولی اہمیت ہے۔ بحالت موجودہ ملک کی بے سروسامانی، برادران وطن کی باہمی ناچاقی۔ خواص کی بے بسی اور عوام کی بے کسی دیکھکر اکثر کم زور دل اور سست عقیدہ احباب کے دلوں میں آئندہ کی طرف سے وسوسے پیدا ہو رہے ہیں لیکن عالمگیر افلاس و جہالت اور تمام دیگر نقائص و خامیوں کے باوجود ہندوستانیوں کے خمیر میں ابھی تک امن و صلح حق و انصاف اور رواداری کا مادّہ باقی ہے چنانچہ اہل ملک نظرۃً امن پسند اور صلح جُو ہیں۔ کروڑوں باشندگان اب بھی پنچایتوں کے فیصلوں کے احترام کے عادی ہیں اور میلے ٹھیلوں، مٹھوں، مزاروں اور خانقاہوں اور روز مرّہ زندگی میں بہت سے موقعوں پر سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہے اور کسی کو ناگوار نہیں ہوتا۔

بقول لارڈ زیٹلینڈ صدیوں پہلے گوتم بدھ کے زمانہ میں ہندوستان میں موجودہ طرز کا جمہوری نظام حکومت جاری تھا۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو انتہائی مشکلات کے باوجود جمہوری اصولوں کے مطابق بنے ہوئے دستور حکومت کی کامیابی میں شک کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس وقت ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر جماعت کی سیاسی ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ حبّ وطن اور ملکی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ یہ ذمہ داریاں خلوص و ایمان داری کے ساتھ ادا کی جائیں ورنہ ہم لوگ ملک کے ساتھ بدترین غداری کے مجرم ہوں گے۔ ہم اخبار نویسوں کے فرائض بھی اس مرحلے پر بہت نازک ہیں۔

مطلق العنان حکومت کا مستقبل

مطلق العنان دفتری حکومت کے زمانہ میں سرکاری نظم و نسق میں عوام یا اُن کے قائم مقاموں کا کوئی دخل نہ تھا۔ حکمراں طبقہ عوام کی قسمت کا مالک و مختار کامل تھا۔ اس لئے اپنی رائے کے بموجب ہمارے اور اپنے سود و بہبود کے لئے جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ لیکن اس دور میں یہ حالت دیر تک باقی نہ رہے گی کیونکہ خواہ کتنے ہی روڑے اٹکائے جائیں اب پولٹیکل طاقت کا سررشتہ جلد ہی رائے عامّہ کے ہاتھ میں آجائے گا۔ ملک نے ہر جگہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنے قائم مقام چن لئے ہیں اور ان میں ردّ و بدل کرنے کی طاقت بھی ان کو حاصل ہوگئی ہے۔ اب تک حکومت عوام کی جواب دہ نہ تھی اس لئے عوام کو بھی پبلک معاملات سے چنداں دل چسپی نہ تھی اور ان کو سیاسی تعلیم دینے کی ضرورت بھی پیدا نہ ہوئی تھی مگر اب جب صوبجاتی وزیر رائے عامّہ کے ماتحت ہوں گے، ہم اخبار نویسوں کو عوام کو مسائل ملکی کے متعلق تعلیم و تربیت دینے کی خدمت اپنے سر لینا ہوگی۔

موجودہ ایکٹ میں گورنران صوبہ کو جاہے جو اختیارات ہوں، لیکن چند ہی سال کے عرصے میں ان کی حیثیت رفتہ رفتہ صرف بادشاہ سلامت کے آئینی قائم مقام کی رہ جائے گی۔ انگلستان کے مشہور ماہر قانون سر جان سائمن کے قول قیاس اکبر

مطابق برطانوی آئین کے رو سے خود بادشاہ سلامت کے اختیارات ملک کے عام حالات و واقعات سے مطلع رہنے، مسائل ملکی میں اپنے وزیروں کو مشورہ دینے اور ان کے سیاسی طرز عمل کے نتائج سے اُن کو متنبہ کرنے تک محدود ہیں۔

ہندوستان میں اس پوزیشن کے حاصل ہونے میں ابھی عرصہ درکار ہے۔ یہاں مختلف وجوہات سے گورنروں کو ابھی ہر معاملہ میں دخل دینے کا اختیار حاصل ہے لیکن بالآخر ہندوستان میں بھی گورنر جنرل اور گورنران صوبہ کو اس سے زیادہ اختیارات نہ ہوں گے جو خود ملک معظم کو حکومت انگلستان میں حاصل ہیں۔ اس اثنار میں صوبجاتی پریس کی اہمیت اور اُس کا دائرۂ اثر بہت بڑھ جانا چاہیئے۔ گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے نقطۂ خیال سے اخبارات کو ایک خاص پوزیشن حاصل ہوگی۔ اس لئے ہم کو اس وقت اپنی حالت اور ذمہ داریوں کا صحیح اندازہ کرکے اپنی اصلاح اور تنظیم کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے اُردو پریس کانفرنس کی تحریک نہایت باموقع ہے۔

اخبارات کے مستقبل پر تبادلۂ خیالات کی ضرورت

صاحبان! یہی وقت ہے کہ باہمی تبادلۂ خیالات سے ہم نئی ذمہ داریوں کے سنبھالنے کی قابلیت پیدا کریں۔ تاکہ صوبہ کی سیاسیات میں اُردو اخبارات اپنے واجبی حق و حصّہ سے محروم نہ رہیں ملک کی تبدیل شدہ حالت کے لحاظ سے ہم کو اپنی عام پالیسی میں ترمیم و اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ نئے حالات میں کس طرح ہم اپنے اخباری فرائض قابل اطمینان طریقے پر ادا کرسکتے ہیں۔ موجودہ واقعات ہم کو کیا سبق دیتے ہیں؟ عام رجحان کس طرف ہے؟ اور ہم اُس سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟ یہاں پر مجھکو کسی پارٹی پالیٹکس سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ ملکی حالات پر محض ایک اخبار نویس کے نقطۂ خیال سے نظر ڈالنا ہے۔ اس وقت اس سے کوئی بحث نہیں کہ کس جماعت کو اقتدار حاصل ہوگیا ہے اور انتخابات میں کس کو فتح اور کس کو شکست ہوئی ہے۔ بلکہ فتح و شکست کے اصولی اسباب پر غور کرکے اپنے

واسطے ایک صحیح راہ عمل تجویز کرنا ہے۔

نیا آئین خواہ کتنا ہی ناقابل اطمینان کیوں نہ ہو لیکن اس نے عوام کی ایک بڑی تعداد کو ووٹ کا حق دے کر ہم کو اہل ملک سے براہ راست اپیل کرنے اور ان کے ضروریات و خیالات سے دل چسپی لینے اور ان پر اثر قائم رکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم نے اس بات کو بخوبی دیکھ لیا ہے کہ عوام نے سوسائٹی کے پرانے لیڈروں کو کس طرح پس پشت ڈال دیا اور پرانے اثرات زور اور دباؤ کے باوجود پہلے ہی موقع پر جس کو اپنا خیر خواہ و ہمدرد سمجھا بے خوفی سے اُس کو ووٹ دیا۔ اب ہمارے لیڈروں کے لئے صرف تعلیم یافتہ جماعت کو رضامند رکھنا کافی نہ ہوگا کیونکہ آئندہ خواص کا اثر نسبتاً کم ہو جائے گا۔ اسمبلی میں بھی ملکی قائم مقاموں کو ہر مسئلہ کو عوام کے نقطۂ خیال سے دیکھنا ہوگا۔ ہر بات میں رفاہ عام کے خیال کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ عام دوٹروں کو خوش رکھنے اور ان کے سود و بہبود کی فکر کرنا ہوگی، عام مالی حالت کو درست کرنا ہوگا لوگوں کے آرام آسائش اور تعلیم و تربیت کی کوشش کرنا پڑے گی۔ مثلاً ابھی صوبہ متحدہ میں صرف ۳،۲۹ فی صدی آبادی کی تعلیم دینے کا انتظام ہے۔ دس ہی پانچ سال کے اندر جبریہ تعلیم وغیرہ جاری کر کے چالیس پچاس فی صدی آبادی کو حرف شناس بنانا ہوگا اور اگر واقعی کوشش کی جائے تو یہ آسانی سے ممکن ہے۔ آخر جاپان کی حکومت نے اس باب میں کیا کچھ نہیں کر دکھایا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستانی وزیر بھی عوام کی تعلیم کے لئے ایسی ہی کوشش نہ کریں۔

جدید آئین کا اثر اخبارات پر

ہم لوگ اس باب میں کتنے پیچھے ہیں یہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جزائر برطانیہ میں جبریہ تعلیم کا ایکٹ ۱۸۷۰ء میں پاس ہوا تھا جب سے وہاں بچوں کو ابتدائی تعلیم جبریہ دی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسا ہی کرنا ہوگا اور جبریہ تعلیم رائج ہونے کے ساتھ ہی ہندوستانی زبان کے اخبارات کی قسمت جاگ اُٹھے گی۔ نئے اسمبلی میں تقریریں بھی زیادہ تر ہندوستانی زبان میں ہوا کریں گی اور صوبجاتی سیاسیات میں صوبجاتی زبانوں کو ان کا جائز اور واجبی درجہ جو اس وقت

انگریزی زبان نے غصب کر رکھا ہے از سر نو واپس ملے گا۔ مجھے امید ہے کہ چند ہی سال کے اندر ہمارے قانونی اسمبلی کی زبان ہندوستانی قرار دے دی جائے گی اور اس کی کل کارروائی اُردو ہندی میں ہوا کرے گی۔ ابھی تک ہم کو برٹش افسران سے عرض حال کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے انگریزی اخباروں کی قدر بڑھ گئی تھی۔ مگر اب جب کہ ہمارا روئے سخن ہمارے واضعانِ قانون اور ہندوستانی وزرا سے ہوگا اور انھیں بھی اپنے طرز عمل اور کارگزاریوں کے لئے عام باشندوں سے مقبولیت کی سند لینا ہوگی تو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ہندوستان کا پریس بھی سلطنت کا ایک ضروری رُکن سمجھا جائے گا۔ اب تک ہمارے حکمران اُردو ہندی اخبارات کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ لیکن عن قریب ہی پوزیشن بدلنے والی ہے جس میں صوبجاتی زبان کے اخبارات کی اہمیت خواہ مخواہ بڑھ جائے گی۔ مگر پورا وقار اور اثر حاصل کرنے کے لئے ہندوستانی اخبارات کو بھی اپنی حالت درست کرنا پڑے گی۔ رفاہ عام کے مقصد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا ہوگا۔ عام بہبودی کا خیال رکھنا ہوگا۔ فرقہ وارانہ نقطۂ خیال کو معدوم کرنا ہوگا اور اخبارات کو صوبہ کے مفاد کا سچا محافظ اور رائے عامہ کا صحیح ترجمان بننا ہوگا۔ اس لئے ہماری تحریروں اور ہمارے خیالات میں ان تمام ذمہ داریوں کا اثر نمایاں ہونا چاہیئے جو ایک خوددار اور خودمختار قوم کے اخبارات کے لئے لازمی ہیں۔ ابھی تک اُردو ہندی پریس پر فرقہ وارانہ ذہنیت غالب ہے مگر اب اس تنگ نظری کا کوئی موقع باقی نہیں ہے۔ اس لئے ہم اخبار نویسوں کو تعصب و تنگ دلی کی پالیسی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ حال ہی میں پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں نے اس سلسلہ میں اپنے صوبے کے اخبار نویسوں سے کشادہ دلی سے تبادلۂ خیالات فرمایا تھا۔ اس ملاقات کے دوران میں آپ نے ہندوستانی پریس کی آئندہ ترقی کے لئے جو کچھ فرمایا وہ سب اخبار نویسوں کے واسطے یکساں مفید ہے۔ آپ کا عزم ہے کہ پنجاب میں تین سال کے اندر فرقہ پرستی کے عیب کو بالکل فنا کر دیں۔ آپ نے اس بارے میں پریس کی اہمیت پورے طور پر محسوس کر لی ہے۔ چنانچہ ایڈیٹران اخبار کو اپنی طرف سے ہر قسم کی

سہولتیں دینے کا وعدہ فرمانے کے ساتھ ساتھ آپ نے پریس ایکٹ کے متعلق بھی ایک جدید نظریہ پیش کیا ہے جو ہندوستانی سیاسیات کی تاریخ میں ایک روشن باب ہوگا۔ آپ نے اخبار نویسوں سے فرقہ وارانہ تعصبات مٹانے کی اپیل کرتے ہوئے اس بات کی تنبیہ کی ہے کہ اُن کے عہد حکومت میں فرقہ وارانہ اختلافات پیدا کرنے والے اخبارات کی خیر نہ ہوگی اور وہ اس معاملہ میں پریس ایکٹ کی دفعات سے پورا فائدہ اُٹھائیں گے۔ ہم کو اُمید ہے کہ معزز معاصرین پنجاب سر سکندر حیات خاں صاحب کو اس بارے میں سخت گیری کا موقع نہ دیں گے۔

فرقہ وارانہ ذہنیت اور اخبارات

حضرات! پنجاب ہو یا صوبۂ آگرہ و اودھ فرقہ وارانہ ذہنیت قائم رکھنے اور اُسے ترقی دینے میں اخبارات کو ہمیشہ بہت بڑا دخل رہتا ہے۔ میں اس صاف گوئی کے لئے آپ سے عاجزانہ معافی کا خواستگار ہوں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ورنیکلر پریس کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ وہ عموماً چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی فرقہ وارانہ عینک سے دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کہیں کوئی چور گرفتار ہوتا ہے یا کوئی گرہ کٹ سزا پاتا ہے یا کسی سے کوئی اور بداخلاقی سرزد ہوتی ہے تو اکثر اُردو اخبارات میں جلی حروف میں ملزم کا آبائی مذہب واضح کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اخلاقی قصورواروں کو کسی مذہب سے دور کا تعلق بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب کبھی سزا دینے والے حاکم اور سزا پانے والے مجرم مختلف مذاہب کے پیرو ہوتے ہیں تو اکثر اوقات اخبارات میں اس مذہبی اختلاف کی بدنما تشریح کر دی جاتی ہے۔

اسی قبیل کی اور بہت سی دل آزار باتیں ہیں جن سے ہم لوگ تھوڑی سی احتیاط سے اپنے اخبارات کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

صاحبان! وقت آگیا ہے کہ ہم ان باتوں میں ضروری اصلاح کریں ابھی تک یہ مشغلہ خود غرض لیڈروں یا ملازمت سرکاری کے خواہشمندوں کے مفید مطلب ہونے کی وجہ سے مقبول و مفید ہوتا تھا۔ مگر اب یہ رویہ پریس کی رسوائی کا باعث ہوگا۔

یہاں پر میری یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ کسی جماعت یا طبقے کی جائز شکایات درج اخبار نہ ہوں یا ہم اخبار نویس کسی فرقہ کے حقوق پامال ہونے دیں یا اُن کے حقوق کی وکالت نہ کریں۔ میری منشا صرف یہ ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو ہم اپنے زبان وقلم پر اعتدال و متانت کی پابندیاں عائد کریں اور بہت سی باتوں کو جو راست مگر فتنہ انگیز ہیں منظر عام پر لانے سے پرہیز کریں۔ اس سے کسی کو کوئی مستقل نفع نہیں پہونچتا۔ بلکہ ملک کو اُلٹا نقصان پہونچتا ہے۔ ان باتوں کو ذمہ دار لوگوں تک پہونچانے کے لئے اخبارات کے علاوہ اور موثر ذرائع ہیں جن سے لیڈرانِ قوم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اُردو اخبارات کے لئے ایک اور غور طلب مسئلہ ہے۔ ابھی تک لوگوں کو خواص اور ان کے لیڈروں سے واسطہ تھا جن میں سے اکثر اصحاب شہروں کے نیم تعلیم یافتہ و جاہل طبقے کے رہنما ہیں اور انھیں سے ہر وقت کھیلا کرتے ہیں۔ اس لئے اخبارات کے لئے بھی اس کھیل میں شامل ہو جانا آسان تھا لیکن اب ملک کی اہم سیاسی تحریکیں عوام سے براہ راست اپیل کرنے کا فارمولا تجویز کر رہی ہیں۔ چنانچہ کانگریس نے دیہاتی آبادی سے اقتصادی میدان میں براہ راست رابطۂ اتحاد اور اشتراک عمل پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ دوسری پارٹیوں کو بھی اپنا اثر و اقتدار برقرار رکھنا ہے تو اسی لائن پر چلنا چاہیئے۔ ایسی صورت میں اخبار نویسوں کو بھی سوچنا چاہیئے کہ وہ کس طبقے کی نمائندگی کریں۔ خوب سمجھ لیجئے اب کسی کو کوئی مقدس پوزیشن حاصل نہیں رہی۔ ہندوستانی اخبارات بھی اپنے رویہ کے بدولت امریکہ کے اخبارات کی طرح رائے عامّہ سے بیگانہ ہو سکتے ہیں مگر اُردو پریس کے لئے یوسف بے کارواں ہو کر زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ امریکن پریس ایک نہایت ترقی یافتہ پریس ہے۔ اُسے مقتدر سرمایہ داروں کی سرپرستی حاصل ہے جن سے اس کو لاکھوں کروروں روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ امریکہ کی سیاسی تنظیم نے پیشہ کو مالی حیثیت سے نفع بخش تو بنا دیا ہے لیکن امریکن اخبارات کو عام رائے پر کوئی اثر حاصل نہیں۔ عام رائے اخبارات کے بہ نسبت ہمیشہ پلیٹ فارم سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دفعہ پریسیڈنشل انتخاب میں

امریکہ کے ۶۵ فی صدی اخبارات نے مسٹر روزولٹ کے خلاف ایک جہاد عظیم برپا کر رکھا تھا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور عوام نے اُن کو غیر معمولی کثرت رائے سے دوبارہ منتخب کیا۔

وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے عوام الناس نے اس بات کو بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ ان کے اخبارات اپنی ایمان دارانہ رائے نہیں رکھتے۔ بلکہ مقتدر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کٹ پُتلی بن گئے ہیں۔ اُردو اخبارات کے لئے یہ حالت موت کے برابر ہوگی ہمارے لئے پریس کی مفروضہ طاقت کے زعم باطل پر واقعات سے چشم پوشی کرنا سخت غلطی ہوگی۔ اس لئے میں بہ منت عرض کروں گا کہ ہم کو غلط خیالات، غلط اصولوں اور غلط رویہ سے بچ کر کام کرنا چاہیئے۔ فرقہ وار نقطۂ خیال کی ابھی تک چاہے جتنی قدر کی گئی ہو لیکن آیندہ کے لئے اس کی ہردل عزیزی ختم شدہ سمجھ لینا چاہیئے۔

طریقۂ کار میں تبدیلی و اصلاح کی ضرورت

سیاسی لیڈروں کو اب عوام سے واسطہ رہے گا۔ کانگریس اور اُس کی تقلید پر دوسری جماعتیں عوام کے پاس اپنے پیغام براہ راست بھیجنے کا بندوبست کر رہی ہیں۔ اس لئے کاروباری نقطۂ خیال سے بھی ہم کو اپنے وتیرہ کو بدل دینا چاہیئے اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں پر زیادہ توجہ دینے یا زور قلم صرف کرنے کے بجائے رفاہ عام کے بڑے بڑے مسئلوں پر غور کرنا چاہیئے اور اپنے اخبارات کو فرقہ وار نقطۂ خیال کی نیابت سے ہٹا کر مفاد عام کو آرگن بنا دینا چاہیئے۔ ہر معاملہ کو حق و انصاف کی ترازو میں تولنا چاہیئے اور ہر پہلو پر غور کر کے رائے قائم کرنا چاہیئے۔ تاکہ آزاد ملکوں کے اخبارات کو جو اعلیٰ پوزیشن حاصل ہے وہی اُردو پریس کو بھی حاصل ہو۔

رفاہ عام کے خیال اور حب وطن کے مطالبے کو مقدم رکھ کر ہی ہم پبلک اخلاق کا معیار بلند کر سکتے ہیں۔

صاحبان! عوام تک پہونچنے کے لئے ہم کو اپنے اخبارات کی زبان عام فہم بنانا ہوگی۔ عوام کے جذبات کی ترجمانی اور اُن کے حقوق کی وکالت کے لئے ہم کو سادہ اور سلیس زبان استعمال کرنا چاہیئے۔ اپنی تحریروں میں ہم کو مشکل الفاظ اور

نامانوس فقروں کے بجائے حتی المقدور سہل اور عام فہم اور مروجہ الفاظ کو ترجیح دینا چاہئیے۔ اس کے متعلق اگر اُردو پریس کانفرنس کے ماتحت کوئی متفقہ اصول طے ہو جائے یا مختلف الفاظ اور اصطلاحوں کے بارے میں کوئی باہمی فیصلہ ہو جائے تو وہ سب کے لئے مفید ہوگا۔ میری رائے میں ہم کو نامانوس اور اجنبی الفاظ کو یک قلم خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ اور نئی نئی اصطلاحیں گڑھنے سے محترز رہنا چاہیئے۔ تاکہ ہماری تحریریں عوام کے ذہن نشین ہو سکیں اور اُردو کی ہر دل عزیزی میں ترقی ہو۔

اشتہارات کی عبارت میں بھی ہم کو اخلاق و تہذیب کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ بعض معزز اخباروں نے اس بارے میں دیگر معاصرین کے لیئے ایک قابل تقلید مثال قائم کردی ہے۔ یہاں پر میں مثال کے طور پر صرف دو معاصرین کا ذکر کروں گا۔ ہم عصر ریاست دہلی کو اشتہارات سے کثیر آمدنی ہوتی ہے لیکن اُس میں فحش اشتہارات شائع نہیں ہونے پاتے۔ بلکہ ان کے خلاف معزز ریاست میں وقتاً فوقتاً مخالفت کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ حال میں معزز اخبار مدینہ نے بھی اپنے یہاں مخرب اخلاق اور عریاں اشتہارات کی اشاعت ممنوع کردی ہے۔ مجھکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی اخبارات جو بے احتیاطی برتتے ہیں اُس کی وجہ سے کچھ دنوں سے انگلستان وغیرہ کی بنی ہوئی معمولی مقوی غذاؤں کے ہندوستانی اشتہارات میں بھی یہاں کے اخباری مذاق کی جھلک دکھائی دینے لگی ہے۔ ہماری کانفرنس اس بارے میں اُردو پریس کی بخوبی رہنمائی کر سکتی ہے۔ فحش اور مخرب اخلاق کتابوں اور دھوکہ باز لوگوں کے ہتھکنڈوں سے پبلک کو بچانا بھی اخبارات کا فرض مقدم ہے۔ مثلاً حال میں بعض انگریزی رسالوں کی تقلید میں اطراف ملک کے جعل سازوں نے انعامی معموں کے اشتہارات کے ذریعے لوگوں کو دھوکا دے کر روپیہ وصول کرنا شروع کردیا ہے۔ یہ لوگ خود اخباروں کو بھی جن کے ذریعہ وہ روپیہ پیدا کرتے ہیں دھوکا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کاروباری حیثیت سے نیک و بد کی تمیز بہت مشکل ہے۔ لیکن باہمی تنظیم سے ان لوگوں کی نقصان پہونچانے کی قوت محدود کی جاسکتی ہے۔ مثلاً

پریس کانفرنس کے دفتر میں بدمعاملہ مشتہرین کی فہرست رکھی جاسکتی ہے اور اس سے سب اخبارات یکساں فائدہ اُٹھاسکتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم لوگ اشتہاروں کے متعلق چند اصول باہم طے کرلیں جن پر ہر اخبار میں عمل کیا جائے۔ اسی طرح بدمعاملہ ایجنٹوں کی فہرست بھی مرتب ہوسکتی ہے اور شرح کمیشن مقرر کی جاسکتی ہے۔ اتفاق رائے کے سامنے ذی اثر اور رسوخ یافتہ ایجنسیوں کو بھی مناسب شرح قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ مثلاً اگر ایک ریلوے ایجنسی ہندوستانی اخباروں اور رسالوں سے چالیس فی صدی کمیشن لینے کی عادی ہے تو اُس کا علاج اتفاق رائے سے ممکن ہے۔ اسی طرح اور بہت سی باتیں ہم اخبار نویسوں کے کاروباری سہولت کے لئے ضروری ہیں۔ اُردو پریس کو تمام سرکاری اطلاعیں اُردو زبان میں ملنا چاہئیں گورنمنٹ کو اپنے سکرٹریٹ کے ساتھ ایک پریس روم یا پریس کلب کھولنا چاہیئے۔ جہاں ہر اخبار نویس کو ضروری اطلاعیں بہم پہونچانے کا انتظام کیا جائے۔ گورنمنٹ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں بھی اصولی اصلاح و ترقی کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ دفاتر صرف سرکاری کارروائیوں کے متعلق صحیح اطلاعات بہم پہونچانے کا فرض ادا کریں۔ پروپگنڈا کا کام ملکی اخبارات پر چھوڑ دیا جائے موجودہ وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے اپنی تشریف آوری کے بعد ہی ایک تقریر کے دوران میں اس مسئلہ پر توجہ دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اس لئے نئی اصلاحات کے اجرا کے ساتھ ہی گورنمنٹ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کی بھی نئی تنظیم ہونا لازمی ہے۔ میری رائے میں محکمۂ اطلاعات کی رہنمائی میں غیر سرکاری عنصر اور صوبہ کے اخبار نویسوں کو کافی دخل ہونا چاہیئے۔

اخبارات کی تنظیم و اتحاد عمل

صاحبان! ابھی تک ہم لوگ اپنی تنظیم سے غافل رہے حالانکہ ۱۹۱۵ء سے ایک آل انڈیا پریس ایسوسی ایشن قائم ہے۔ لاہور و لکھنؤ وغیرہ میں بھی حال میں جرنلسٹ ایسوسی ایشن قائم ہوئی ہیں۔ ان مختلف انجمنوں کو ایک تنظیم کے اندر کام کرنا چاہیئے تاکہ ہماری مشترکہ ضروریات متفقہ کوشش سے پوری ہوسکیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو سخت گیریاں وقتاً فوقتاً اخبارات پر عائد ہوتی ہیں

اُن کا علاج ایک بڑے آرگینیزیشن کی امداد کے بغیر ممکن نہیں۔ کاروباری مسائل بھی مشترکہ جدوجہد کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ یہ مسئلے آئے دن پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ محصول ڈاک کے متعلق اخبارات کو جو رعائتیں حاصل تھیں اُن میں حال ہی میں نسبتہً فرق آگیا ہے۔ ڈپارٹمنٹل افسروں کی نظر اخبارات کی طرف خواہ مخواہ ترچھی ہوتی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر آل انڈیا انجمن اخبار نویسان بہت مؤثر ایجی ٹیشن کر سکتی ہے۔ پچھلے سال میری درخواست پر بابو سری پرکاش صاحب ممبر لیجیلیٹو اسمبلی نے گورنمنٹ ہند سے ایک خفیف سی رعایت منظور کرا دی تھی جس کے رو سے ایک پیسے کے ٹکٹ ڈاک میں آٹھ تولہ وزن کے بجائے اب دس تولہ وزن کے اخبارات جانے لگے ہیں۔ لیکن اس سال سے عجیب سخت گیری کا برتاؤ شروع کر دیا گیا ہے۔ یعنی اخبارات کی اشاعت میں ذرا سی بھی دیر ہو جائے تو وہ رعایتی شرح محصول ڈاک سے محروم کر دیئے جاتے ہیں اور اگر کسی خریدار کے پاس اخبارات کے پچھلے پرچے بھیجنا ہوں تو وہ معمولی بُک پوسٹ کی شرح سے جائیں گے۔ یہ سختی ماہوار رسالوں کے لئے تو بہت ہی نقصان رساں ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ بعد میں بھی آغاز سال سے خریدار ہونا پسند کرتے ہیں کبھی کبھی ڈاک خانہ کی غفلت سے پرچے گم یا غلط تقسیم ہو جایا کرتے ہیں اور لوگ مکمل جلد رکھنے کی خاطر گم شدہ پرچے منگاتے رہتے ہیں۔ اشتہارات کے سلسلے میں بھی اکثر پچھلے پرچوں کی مانگ ہوتی ہے۔ ان سب فرمائشات کی معمولی بک پوسٹ کی شرح سے تعمیل ہوگی تو اخبارات ورسائل اور اُن کے خریدار ان دونوں کا دیوالہ نکل جائے گا۔ گورنمنٹ کو کم از کم یہ سخت گیری روا نہ رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح اخبارات اور کتابوں کے قیمت طلب پارسلوں میں رجسٹری کی قید سراسر تکلیف دہ ہے۔ اگر یہ بالکل معاف نہ ہو سکے تو کم سے کم نصف کی تخفیف تو ضرور ہو جانا چاہیئے۔ قیمت طلب پارسلوں کا محصول بھی بہت زیادہ ہے مثلاً ایک روپیہ کے قیمت طلب پارسل کے لئے بھی خریدار کو پانچ آنہ ادا کرنا پڑتے ہیں۔ اس میں اور پریس کے لئے ٹیلیفون اور تبادلہ کی شرح میں بھی بقدر نصف کے کمی ہونا چاہیئے۔ اخبارات کے رجسٹرڈ پیکٹ اور چندہ کی چھوٹی چھوٹی رقم کے منی آرڈروں

کی شرح بھی نصف ہو جانا چاہیئے۔ تار کے لئے اخباروں کے پتے حسب سابق بلا کسی فیس کے درج رجسٹر ہونا چاہئیں ڈاک خانہ کے ونڈو ڈلیوری کے متعلق بھی اخبارات کو رعایت ملنا چاہیئے۔ یہ مطالبے ایک مرکزی انجمن کے ذریعہ مؤثر طریقے سے پیش کئے جا سکتے ہیں کاغذ اور سامان طباعت کو سستا کرنے کی کوشش بھی ضروری ہے۔ ہم کو امید ہے کہ نئے نظام حکومت میں ہمارے قائم مقاموں کو ان سب امور پر خاص توجہ دینے کی توفیق ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے۔ گزشتہ جنگ کے دوران میں صوبے کے اکثر اضلاع سے سرکاری رہنمائی میں جنگی خبروں کے شیٹ شائع ہونا شروع ہوئے تھے۔ جنگ کے بعد تحریک نان کوآپریشن کے زمانہ میں صوبہ بھر میں خواہ مخواہ کی امن سبھائیں قائم کر دی گئی تھیں اور ان نام نہاد سبھاؤں نے افسران ضلع کی سرپرستی میں ان جنگی خبروں والے مقامی پرچوں کو عدالتوں کے سمن اور نوٹسوں کے بھروسے پر اخباری صورت دے دی ہے۔ چنانچہ ان برائے نام پرچوں نے جو کہیں کہیں ڈسٹرکٹ گزٹ کے نام سے بھی شائع ہو رہے ہیں اُردو پریس کو نقصان عظیم پہنچایا ہے۔ اکثر مقامات میں یہی پرچے عدالتی کاموں کے ٹھیکہ دار ہو گئے ہیں۔ اس معاملہ میں گورنمنٹ اور عدالہائے عالیہ کی پالیسی بے لوثی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اصل و نقل کی پہچان مشکل نہیں ہے۔ میں صرف اصل جنس کی حوصلہ افزائی کا خواہش مند ہوں اور کسی خاص طبقے کی سرپرستی کا قائل نہیں۔ بہر حال گورنمنٹ کے ذمہ دار محکموں کا فرض ہونا چاہیئے کہ پریس کی دشواریوں میں مزید مشکلات کا اضافہ نہ ہونے دیں۔ کیونکہ اخبار نویسی کے معزز پیشے کو ہر ممکن طریقے سے تقویت دینا ایک ترقی یافتہ گورنمنٹ کا فرض مقدم ہونا چاہیئے۔

ایک اہم مطالبہ | ان جزئیات کے علاوہ ہمارا سب سے اہم اور پُر زور مطالبہ پریس کی مکمل اور قطعی آزادی ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے شروع سے اب تک اخبارات کو ان کی واجبی آزادی سے محروم کر رکھا ہے۔ انگلستان میں بھی یہ آزادی مسلسل جد وجہد کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ لیکن وہاں ۱۶۹۳ء کے بعد سے پریس کے خلاف کوئی قانون پاس نہیں ہو سکا۔ گو انگریزی پریس اسٹامپ ڈیوٹی کے منسوخی کے بعد ہی ۱۸۵۶ء میں

پورے طور پر آزاد ہوا ہے۔ اُس وقت سے اب تک برطانوی اخبارات پر (سوائے زمانہ جنگ کے) کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ امریکہ اور اکثر یورپین ممالک میں بھی پریس کو پوری آزادی حاصل ہے۔ دنیا کے بہت سے آزاد ملکوں میں پریس کی آزادی کو آئینی حیثیت سے باضابطہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سیاسی آزادی کی پہلی شرط زبان اور قلم کی آزادی ہے ملٹن تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ خواہ کوئی اور آزادی نصیب ہو یا نہ ہو لیکن معلومات حاصل کرنے، مطالب ادا کرنے اور ضمیر کے مطابق دلائل پیش کرنے کی سب کو پوری آزادی ہونا چاہیئے سر چارلس مٹکاف سو سال سے زائد ہوئے یہ لکھ گئے ہیں کہ پریس کی آزادی کے فوائد اس کے مضر نتائج سے کہیں زیادہ ہیں۔

صاحبان! اظہار رائے کی آزادی انسان کے ازلی حقوق میں داخل ہے یہ کوئی رعایت نہیں بلکہ انسانی حق ہے جس کے قائم کرنے کے لئے بقول ایک فرانسیسی مصنف انسان کو مطعون ہونے و نشانۂ ملامت بننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ وہ لکھتا ہے کہ قید اور قتل کے خوف سے بھی انسان کو اپنی رائے کے اظہار و اشاعت سے باز نہ رہنا چاہیئے۔

پریس کی آزادی یہاں پر آپ کی اجازت سے مختصراً آزادی پریس کی تشریح بے جا نہ ہو گی۔ اس آزادی کے اس کے سوائے اور کچھ معنی نہیں ہیں کہ ہر شخص کو گورنمنٹ کی طرف سے کسی طرح کی ذمہ داری یا پابندی عائد ہوئے بغیر اپنے حسب دل خواہ ہر بات کے چھاپنے کا اختیار حاصل ہو۔ اصولی حیثیت سے آزادی پریس اور آزادی تقریر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا ایک ہی بنیادی اصول ہے۔ مگر تقریر اور طباعت کی یہ آزادی کسی شخص کو معمولی قانون کی زد سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ جو شخص اپنے حقوق کا بے جا استعمال کرے گا اسے قانون کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اس حق پر اخلاقاً اور قانوناً صرف تین ہی قسم کی پابندیاں عائد ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ان قیود کے علاوہ ہندوستان میں بھی کسی مزید پابندی کی حاجت نہیں ہے۔ پابندیاں یہ ہیں:۔

اوّل یہ کہ مذہب اور اخلاق عامّہ کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔
دوسرے یہ کہ کسی شخص کی ہتک عزت نہ کی جائے اور نہ کسی کی شہرت پر کوئی بے جا حملہ کیا جائے۔
تیسرے یہ کہ مصنفین و مولفین کے حقوق کاپی رائٹ قائم و برقرار رکھے جائیں۔

کسی ملک میں پریس پر اس سے زیادہ پابندیوں کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہندوستان پر حکومت کو اہل ملک پر کبھی وثوق نہیں رہا۔ اسی لئے ہم اس وقت تک اس ابتدائی انسانی حق سے محروم ہیں۔ اخبارات پر شروع ہی سے حکام وقت کی نظر عتاب رہی ہے چنانچہ لارڈ ولیزلی کے زمانہ میں چار سال کے دوران میں دو انگریز اخبار نویس یکے بعد دیگرے محض اس بنا پر ملک بدر کر دیئے گئے تھے کہ ایک نے فوج کے متعلق ایک قابل اعتراض مضمون لکھا تھا اور دوسرے شخص نے کلکتہ کے ایک مجسٹریٹ کی نکتہ چینی کرنے کی جرأت کی تھی۔ اس کے بعد یہ حالت تو نہ رہی لیکن مختلف اوقات میں پریس کے قوانین میں ردوبدل ہوتے رہے جن میں پریس کی آزادی کا اصول بھی کبھی پورے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس وقت بھی گورنمنٹ کی سختیاں باقی اور ایڈیٹران اخبار پر متعدد پابندیاں عائد ہیں۔ آپ صاحبان ان قیود سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے یہاں اُن کا مفصل بیان فضول ہوگا۔ ۱۹۲۱ء میں پریس ایکٹ کی ضروری ترمیمات پر غور کرنے کے لئے سر ولیم ونسنٹ ہوم ممبر کی صدارت میں ایک کمیٹی بیٹھی تھی جس کے روبرو مجھے بھی شہادت دینے کا موقع ملا تھا لیکن اس کمیٹی نے بھی ہماری دادرسی نہیں کی۔ اس کے لئے موجودہ وقت شائد کچھ زیادہ موافق ثابت ہو۔ اس لئے تمام ہندوستانی پریس کو گورنمنٹ سے مشترکہ و متفقہ طور پر آزادی قلم کا حق طلب کرنا چاہیئے اور پوری جدوجہد کرنا چاہیئے کہ نئے آئین میں یہ آزادی واضح طور پر تسلیم کر لی جائے۔ ہماری کانفرنس نئے وزراء صوبہ سے اس بارے میں بہت کچھ ہمدردی کی توقع کر سکتی ہے۔ میں سر سکندر حیات خاں کے تقرر کا ذکر کر ہی چکا ہوں۔ بنگال کے وزیر اعظم مسٹر اے کے فضل الحق نے بھی پچھلے ہفتہ یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ انھیں پریس کے قوانین و

ضوابط میں بعض دفعات کے فوری ترمیم کی ضرورت کا پورا احساس ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ ہمارے صوبہ کے نئے وزیر اعظم بھی خواہ وہ کسی پارٹی کے ہوں وزرائے بنگال و پنجاب سے متفق ہونگے اور مروجہ تنگ خیالی سے بالاتر ہو کر پریس کی آزادی بحال کرنے کی تدبیریں عمل میں لائیں گے۔

مگر حضرات! جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں پریس کی آبرو بہت کچھ ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے۔ ہمارا اصلی وقار اور ہمارا واقعی اثر خود ہمارے اخبارات کے طرزِ عمل اور ہمارے تنظیم و جذبۂ خودداری پر منحصر ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ایڈیٹران اُردو پریس کسی ملک کے اخبار نویسوں سے کم نہیں ہیں۔ ہم کو اب بھی مرحوم بابو گنگا پرشاد ورما اور سید بشیر الدین صاحب کی ذاتِ گرامی پر فخر ہے اور رہے گا۔ لیکن ابھی اُردو اخبارات و رسائل کے کثیر تعداد کی حالت محتاجِ اصلاح ہے۔

اردو پریس کی مالی کمزوری

بد قسمتی سے اُردو پریس کی مالی حالت بھی اچھی نہیں ہے اور سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ موجودہ اشاعتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کے لئے تنظیم و ترقی کی کیا صورت ممکن ہے۔ انگلستان میں بھی پچاس سال پہلے تک اخبار نویسی کا پیشہ بالکل نفع بخش نہ تھا۔ وہاں بھی اخبارات کی ترقی روٹری پریس کے رواج کے بعد ہی شروع ہوئی ہے۔ اس ترقی میں اشتہارات کی اُجرت کو بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ صرف لندن کے اخبارات کو اشتہارات سے ایک کروڑ تیس لاکھ پاونڈ آمدنی ہوتی ہے۔ یہ ترقی زیادہ تر ۱۸۹۰ء سے ہوئی ہے۔ اب انگلستان کے اخبارات کا یہ حال ہے کہ اُن کی مجموعی اشاعت کا اندازہ پندرہ کروڑ روزانہ کیا جاتا ہے۔ اس حساب سے ہر گھر میں ایک سے زائد روزانہ اخبار کا اوسط پڑتا ہے۔ وہاں کے اخبارات کی اشاعت کا اندازہ ایسے ہو سکتا ہے کہ مزدور جماعت کے اخبار ڈیلی ہیرلڈ کی اشاعت ۱۹۳۳ء میں تیس لاکھ تھی۔ سرکاری رپورٹ کے بموجب صوبۂ متحدہ میں چھوٹے بڑے کل ۶۹۴ پرچے ہیں جن میں ۳۱ روزانہ۔ ۱۲ ہفتہ میں دوبارہ۔ ۲۳۷ ہفتہ وار ۲ اور ۲۲۶ ماہوار ہیں۔ ان میں سے صرف دو انگریزی، دو اُردو اور چار ہندی اخباروں کی اشاعت چار ہزار سے

Rotary

زائد بتائی جاتی ہے۔ اور دو انگریزی، پانچ اردو اور گیارہ ہندی اخبارات کی اشاعت دو اور چار ہزار کے درمیان ہے۔ افسوس اور شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ اردو میں ہزار دو ہزار کی اشاعت کا اوسط بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ ہندی کی حالت اردو سے کسی قدر بہتر ہے۔ پچھلے سال صوبہ متحدہ میں کل ۳۴۴۸ مطبوعات میں سے دو ہزار ایک سو بیالیس کتابیں ہندی میں اور صرف ۴۴۳ اردو میں، ۳۳۸ انگریزی میں طبع ہوئیں۔ انگلستان میں ۱۹۳۵ء میں کل ۱۶۶۷۸ کتابیں طبع ہوئیں یعنی روزانہ پینتالیس کتابوں کا اوسط رہا۔

اردو داں جماعت ابھی تک اخبارات رسائل و مستقل مطبوعات پر روپیہ خرچ کرنے کی عادی نہیں ہوئی۔ جن لوگوں کی مالی حالت قابل اطمینان ہے وہ بھی اس مد میں روپیہ صرف کرنا فضول سمجھتے ہیں۔ یہ حالت اردو پریس کی ترقی کے لحاظ سے بہت ہی قابل افسوس ہے۔ اس لئے حامیانِ اردو کو اس طرف جلد سے جلد توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

کتابوں اور اخباروں کی توسیع اشاعت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے حصول معاش کا ایک وسیع میدان نکل سکتا ہے۔ اس وقت انگلستان میں اخبارات کے بدولت ساٹھ ہزار آدمیوں کی بسر اوقات ہوتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں کے اخباروں میں اس سے زیادہ آدمیوں کی کھپت نہ ہو۔ لیکن یہ حالت مستقبل ہی میں حاصل ہوسکتی ہے۔ بہرحال آئندہ کچھ ہو اس وقت اخبار نویسوں کو بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ مالی حالت درست ہونے تک جسے ابھی ایک عرصہ درکار ہے ہم کو سختیاں جھیلنا پڑیں گی۔ اس لئے جس طرح سے بھی ممکن ہو اپنے پیشہ کا معیار، اخبارات کی آبرو اور اپنی ذاتی وقعت قائم رکھنے کے لئے ہم کو ضبط نفس اور ایثار سے کام کرنے کے واسطے تیار رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ ایثار بالآخر بے کار نہ رہے گا۔ خواہ ہم دولت نہ پیدا کرسکیں لیکن عزت سے زندگی ضرور بسر کرسکتے ہیں اور قومی خدمت، ایمان داری سے انجام دینے کا اطمینان ہم کو ضرور حاصل ہوسکتا ہے۔

پیشہ اخبار نویسی کی اہمیت

صاحبان! اخبار نویسی کا پیشہ ایک مقدس اور عظیم القدر پیشہ ہے جو لوگ روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اُنھیں اس طرف متوجہ نہ ہونا چاہیئے ہاں ملکی خدمت کی اس معزز پیشے میں کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا میدان نہایت وسیع ہے اور ہمت و استقلال اور دیانت سے کام کرنے والوں کو اپنے ضمیر کی خوشنودی اور قلب کا اطمینان حاصل ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی وقعت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ جب ہی ممکن ہوگا جب ہم آرام طلبی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر خودداری، ایثار اور مستقل مزاجی سے راہ راست پر چلتے رہیں جو صاحب اس پیشے کی طرف یہ سمجھ کر رجوع ہوں گے کہ تھوڑی سی محنت میں انھیں ہر دل عزیزی حاصل ہو جائے گی اور وہ آسانی سے قومی لیڈر بن جائیں گے، اُنھیں جلد یا دیر مایوسی سے سامنا ہوگا۔ دوسروں سے مالی امداد کی اُمید بھی فضول ہے کسی زمانہ میں بعض اخبارات دیسی ریاستوں سے حصول زر کی اُمید رکھتے تھے۔ اب بعض اصحاب کو سیاسی اقتدار کے دلدادہ لیڈروں اور دیگر رہنماؤں سے نفع اُٹھانے کی فکر رہتی ہے۔ حال میں صوبہ کے ایک مقتدر رہنما نے مجھ سے شکایت کی کہ اُن سے کئی اُردو اخبار نویس پریس وغیرہ کے بہانے سے مالی امداد کے طالب ہوئے۔ ان باتوں سے اپنی عزت کھونے کے سوائے اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ جماعت کے عزّ و وقار میں فرق آتا ہے۔ اس لئے جو صاحب اخبار نویسی کے پیشہ کو اختیار کریں وہ یہ سمجھ کر اس میں داخل ہوں کہ ابھی کم از کم ایک پشت تک اور وہ بمشکل بسر اوقات کر سکیں گے۔ البتہ قومی خدمت کے دلدادہ اخبار نویسوں کی خدمت مقبول ہوگی اور اُنھیں اطمینان قلب اور روحانی مسرت بھی حاصل ہوگی۔

اخبار نویس کا مرتبہ

صاحبان! اخبار نویس ایک معمولی اہل قلم نہیں ہے۔ اُس کا رُتبہ بہت بلند ہے۔ اُس کا درجہ بڑے سے بڑے مُدبّر، نامور سے نامور محبّ ملک اور مشہور قومی لیڈر سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا اثر بظاہر اتنا نمایاں نہیں ہوتا اور اس کا رسوخ خاموشی سے بڑھتا رہتا ہے اور سب تعمیری

کام کرنے والوں کی طرح اسے بھی ہر وقت اپنی جگہ پر ایثار نفس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ سچے اخبار نویس کو تحریر میں وزن اور متانت پیدا کرنا ہوگی۔ اُسے نکتہ چینی کو ذاتیات سے بالاتر رکھنا پڑے گا۔ رائے زنی میں ہر دل عزیزی حاصل کرنے کی فکر سے آزاد رہنا ہوگا اور حمایت ہو یا مخالفت دونوں میں اُسے ہر طرح کے تعصب سے پاک رہنا ہوگا۔ وہ وکالت کرے گا مگر اُس کی وکالت میں طرف داری کا شائبہ نہ ہوگا۔ وہ واقعات اور خبروں میں رد و رعایت سے کام نہ لے گا۔ دوسروں کی اختلاف رائے سے بدظن نہ ہوگا اور مخالفین کو اظہار رائے کا پورا موقع دے گا۔ ایسا اخبار نویس یقیناً ملک اور قوم کے اخلاق کی بلندی کا باعث ہوگا۔

خدا کرے ہمارے اخبارات اس معیار پر پورے اُتریں اور سیاسی ترقی کے دور میں ہمیں تعمیری کام کی توفیق ہو۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنے

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

جناب نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکرٹری کانفرنس

مہینہ میں چار بار شائع ہوتا ہی اور اس میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک، مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کی جاتی ہی۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہی اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہی۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہی۔ اخبار بہت عمدگی و نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہی اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کر کے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہی۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہی۔ قیمت سالانہ عہ/

اڈیٹر: محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ: سید الطاف علی (بی اے) منیجر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

خطبۂ صدارت

شعبۂ اسلامی علوم وفنون

علامہ سید سلیمان ندوی صاحب

ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا تھا، وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کردیا گیا تھا اور ہر شعبہ کا ایک علیحدہ صدر اور مستقل سکرٹری تھا۔

من جملہ ان شعبوں کے ایک شعبہ "اسلامی علوم و فنون" تھا۔ اس شعبہ کے صدر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ اور سکرٹری ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تھے۔

اس شعبہ کا پہلا اجلاس ۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۸ ½ بجے شب اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا، اور دوسرا ۲۹ مارچ کو بوقت ۱۰ بجے صبح آسمان منزل میں ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے بحیثیت صدر شعبہ اسلامی علوم و فنون، اسٹریچی ہال میں جو خطبہ پڑھا وہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ صدارت شعبۂ علوم و فنون اسلامی

از

علامہ سید سلیمان ندوی صاحب

قدر شناسان علم و فن ! ممنون ہوں کہ علما ، اور اہل علم کی اس مجلس میں اس کرسی پر بٹھا کر آپ نے علم و فن کے ایک خدمت گار کی عزت اور آبرو بڑھائی۔

اسلامی علوم و فنون کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگا کر علم و ہنر کے چند قیمتی موتیوں کو نکال کر قدر دانوں کے سامنے پیش کرنا میرے جیسے سست بازو کا کام نہیں، بہر حال مجھے آپ کے سامنے نذرانہ کے لئے کچھ پیش کرنا ہے وہ دُرِ شہوار ہوں یا خزف بازار۔

سب سے پہلے تو ہم کو اس خوشی کا اظہار کرنا ہے کہ مدت کے بعد ہم کو اپنی بھولی ہوئی دولت یاد آئی ہے۔ ورنہ زمانہ کے انقلاب سے یورپ کے نئے علوم و فنون نے ہماری آنکھوں میں وہ خیرگی پیدا کر دی تھی کہ ہمارا اپنا مطلع انوار ہماری نگاہوں سے چھپ گیا تھا۔ علم و فن کسی قوم کی ایسی وراثت نہیں جو کبھی چھن نہ سکے، مختلف قوموں نے باری باری سے علم و فن کی خدمت کی ہے اور جب اس کی ہمت ہار گئی تو دوسری باہمت قوم نے آگے بڑھ کر اس فرض کو ادا کیا۔ اسی طرح دنیا کے آغاز سے آج تک یہ دولت بڑھتی ہی رہی ہے، گھٹی نہیں۔ اس نے خزانوں کے گھر بدلے ہیں، کمائی ہوئی

مقدار کبھی ہاتھ سے نہیں گنوائی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ ذہنی علوم کے علاوہ دوسرے ادبی اور عقلی علوم مسلمانوں نے دوسری قوموں سے حاصل کئے اور اپنے عروج کے دور میں ان کو بڑھا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ پھر زمانہ نے پلٹا کھایا اور اسپین اور سسلی کی راہ سے علم وفن کے مسافر نے یورپ کے ظلمت کدہ میں قدم رکھا اور اپنی تیز مشعل سے ہر رہ گزر کو روشن کرتا گیا۔

مسلمانوں کو یہ فخر ہے کہ انھوں نے اپنے دینی علوم کی جس طرح ترتیب و تدوین کی، کلیات بنائے، اصول وضع کئے، جزئیات اور فروع کی تفصیل کی اور ان میں سے ہر صنف پر تصنیفات کا ڈھیر جس طرح لگا دیا وہ مذہبی قوموں کی تاریخ میں بے نظیر کارنامہ ہے۔ اسلام کے معلم اور ہادی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیروؤں کے ہاتھوں میں قرآن نام ایک کتاب دی تھی اور یہی اسلام کے کتاب خانے کی سب سے پہلی کتاب ہے یہ کتاب تبیاناً لکل شئی تھی۔ اس تبیان کی تفصیل ہمارے وہ سارے دینی علوم ہیں جو آج ہمارے کتب خانوں کی زینت اور ہمارے مذہبی مدرسوں کے نصاب درس ہیں۔

غور کرنے والوں کو یہ نظر آئے گا کہ ہر قوم کے سامنے ایک مرکزی تخیل رہتا ہے جو اس کے ہر علم وفن اور شعر و ادب کا مرکز ہوتا ہے۔ مسلمان قوموں کا یہ تخیل ان کا قرآن ہے۔ انھوں نے جس علم وفن کی خدمت کی اس کی تحریک کا جذبۂ شوق در اصل قرآن پاک ہی کے کسی جز کی خدمت کا ذوق اور جوش تھا۔ قرآن پاک کی ایک ایک آیتوں کی تشریح کی گئی تو علم تفسیر بن گیا۔ حامل قرآن کی قولی اور عملی تشریحوں کو جمع کیا گیا تو علم حدیث پیدا ہو گیا۔ قرآن کے اعتقادی تعلیمات کی عملی تشریح کی گئی اور اس پر عقلی دلائل اور رد و قدح یک جا کئے گئے تو علم کلام نے جنم لیا۔ قرآن کے قانونی مسائل پر جو بحثیں کی گئیں انھوں نے علم فقہ کا جامہ پہن لیا۔ قرآن پاک کے لفظوں کے کسی مسئلہ کے سمجھنے کے جو اصول بنائے گئے ان کا نام اصول فقہ ہو گیا۔ رسول کی تشریحات پر روایتوں اور سندوں کی حیثیت سے جو گفتگو شروع ہوئی وہ اصول حدیث کا ماخذ قرار پائی اور ان کے راویوں کی تاریخی اور اخلاقی گفت و شنید نے اسماء الرجال کا دفتر

تیار کر دیا۔ قرآن پاک کے لفظوں کے صحیح مخرج، طرز ادا، وقف و سکون نے تجوید و قرأت کا فن پیدا کیا۔ ان لفظوں کی صحیح شکلوں کے جاننے پہچاننے اور ان کے صحیح اعرابوں کے معلوم کرنے سے صرف و نحو وجود میں آئی۔ قرآن کے لفظوں، لغتوں اور محاوروں کی دریافت کے لئے علم ادب اور علم لغت کی ترتیب ہوئی۔ غرض اسلامی علوم و فنون کا ہر خط در اصل اسی نقطہ سے شروع ہوا اور کبھی کبھی آگے بڑھکر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے مرکز سے دُور نکل گیا یا مرکز سے ہٹ گیا ہے۔

دخیل علوم (یعنی علم و فن کا وہ سرمایہ جو دوسری قوموں سے منتقل ہو کر مسلمانوں کو سپرد ہوا) اگلے مسلمانوں نے ان کو بھی اپنے اسی مرکز سے ملا کر دنیا کو دکھایا۔ مسلمانوں میں دخیل علوم میں سے سب سے پہلے طب کا فن آیا۔ طب سے کیمیا کی طرف توجہ ہوئی چنانچہ عقلی علوم میں سے بنی اُمیّہ کے دَور میں یہی دو فن مسلمانوں میں داخل ہوئے۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں ابن اثال نے یونانی سے طب کی بعض کتابوں کے ترجمے کئے۔ مروان کے زمانہ میں ماسرجویہ یہودی نے سریانی سے ایک طبی سفینہ (کناش) کا ترجمہ عربی میں کیا اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کو اپنے زمانہ میں شائع کیا اور خالد بن ولید بن معاویہ نے کیمیا اور طب کو عربی میں فروغ دیا اور ہشام کے کاتب ابو جبلہ سالم نے ارسطو کی کتابوں کو عربی قالب میں ڈھالا۔

عباسیوں کے زمانہ میں سب سے پہلے ایرانیوں کے اثر سے نجوم کے فن نے منصور عباسی کے دربار میں جگہ پائی۔ نجوم نے ریاضیات اور فلکیات کی طرف رخ پھیرا اور مامون کے عہد میں جہمیہ کی تحریک نے فلسفہ کی داغ بیل ڈالی اور سلطنت کے دور دراز حصّوں میں کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ قطع مسافت کے خیال نے اسی زمانے میں مختصر اور اچھے راستوں کی دریافت کا شوق پیدا کیا جس نے بعد کو جغرافیہ کا ہیولیٰ اختیار کر لیا۔ غرض اسلام میں عقلی علوم و فنون نے اسی طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں میں اشاعت پائی اور تیسری صدی کے وسط سے مسلمانوں میں ان فنون کے اہل کمال پیدا ہونے لگے۔ عام اندازہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اہل تحقیق تیسری صدی ہجری سے لے کر ساتویں

صدی تک گزرے ہیں یعنی اس وقت تک رہے جب تک چنگیزیوں کی سفاکی نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ نہ بجادی اور ایران وخراسان وعراق میں اہل علم کے قتل عام کا بازار نہ گرم ہوا۔ محقق طوسی المتوفی ۶۷۲ھ اور علامہ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ موسم بہار کا دور اختتام ہیں۔ اس کے بعد شاذ ونادر ہی اہل تحقیق پیدا ہوئے اور اگر ہوئے تو وہ نوادر اور مستثنیات کے حکم میں ہیں اس کے بعد سے جو دور شروع ہوا وہ اہل تقلید کا ہے یعنی ان لوگوں کا ہے جن کا کام اگلوں کی تحقیقات کی نقل اور تکرار رہا اور ان میں سے جو لوگ ممتاز ہوئے انھوں نے اگلوں کی تصانیف کی شرحیں کیں یا حاشیے اور تعلیقات لکھے یا ان کی اچھی اچھی کتابوں کی تلخیص اور اختصار کیا۔

میں ایک مثال دے دوں۔ شیخ عبدالقادر جرجانی المتوفی ۴۷۹ھ نے معانی و بیان میں دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ دو کتابیں لکھیں جو حقیقت میں اس فن کے مباحث کا جوہر اور مغز ہیں اور جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ سے لے کر ثعالبی المتوفی ۴۲۹ھ تک اس فن کے جو مسائل پیدا ہوئے تھے ان کو محیط ہے۔ امام رازی المتوفی ۶۰۶ھ نے الایجاز فی دلائل الاعجاز میں شیخ کی دونوں کتابوں کو جن میں حد درجہ تفصیل وتطویل تھی نچوڑ لیا۔ سکاکی المتوفی ۶۲۶ھ نے مفتاح العلوم کی تیسری قسم میں اس کا خلاصہ کرکے شامل کرلیا۔ خطیب قزوینی المتوفی ۷۳۹ھ نے تلخیص المفتاح میں مفتاح کا خلاصہ کرلیا۔ سعدالدین تفتازانی المتوفی ۷۹۳ھ نے اس کی مطول اور مختصر دو شرحیں لکھیں اور معانی وبیان کو منطق کے قریب کردیا۔ اور عصام الدین اسفرائینی المتوفی ۹۶۱ھ نے اطول کے نام سے معانی وبیان کو بالکل منطق یعنی ذوقی چیز کو عقلی بنانے کی ناکام کوشش کی، اس کے بعد ان پر حواشی لکھے جانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت سے لے کر آج تک ہمارے ہاں کے عربی درسیات میں مختصر المعانی، مطول اور اطول کے سوا معانی اور بیان کے فن میں قدما کی ہر چیز آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور اس وقت تک سامنے نہیں آئی جب تک مفتی عبدہ مرحوم کی کوشش سے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ مصر میں نہ چھپیں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ان کو اپنے نصاب

درس میں داخل کر کے ان کو ہندوستان کے مدرسوں میں روشناس نہ کیا۔

اسی طرح دوسرے فنون کا حال ہے۔

ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کا رواج متاخرین کے دور میں ہوا۔ لودھیوں کے زمانے تک ہندوستان میں اہل ترکستان کے اثر سے صرف فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کا رواج تھا اور اسی کا نام علم ودانائی تھا۔ جدال ومناظرہ انھیں فنون میں ہوتا تھا انھیں کو پڑھکر علماء، قاضی، مفتی اور محتسب کے شاہی عہدے پاتے تھے دینیات میں تفسیر بیضاوی و مدارک کے کچھ اجزاء، اور حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح یا مشارق الانوار کا درس ہوتا تھا، سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی حرمین محترمین سے کتب احادیث کا تحفہ ہندوستان لائے اور شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خانوادہ نے صحاح ستہ کے فیض سے ہندوستان کو معمور کیا۔ ان کتابوں کا شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانے تک یہ حال تھا کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی زبانی مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) اپنی طالب علمی کے زمانہ (۱۳۱۲ھ) میں یہ قصہ سناتے ہیں کہ اس زمانہ میں تفسیر کبیر رازی کا ایک نسخہ صرف شاہی کتب خانہ میں تھا شاہ صاحب کو جب ضرورت ہوتی تھی تو بڑے اہتمام سے اس کو شاہی کتب خانے سے منگواتے تھے۔ بخاری شریف کا یہ حال تھا کہ درس کے پورے حلقہ میں ایک یا دو نسخے ہوتے تھے ان کے اجزا توڑ توڑ کر طالب علموں میں تقسیم ہوتے تھے اور ہر ایک سبق الگ الگ جزو سے باری باری سے ہوتا تھا۔

ہندوستان کے پورے دور میں عربی کا ایک بھی کامل شاعر یا ادیب جو عربوں کے نہج وطرز پر شعر یا نثر لکھتا ہو، پیدا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نثر میں مقامات حریری جیسی بے مزہ کتاب اور نظم میں دیوان متنبی جیسے عجمیانہ شاعری کا دیوان عربی طالب علموں کے سامنے رہتا تھا۔ اس پورے دور میں قاضی عبدالمقتدر دہلوی المتوفی ۷۹۱ھ نظم میں اور شاہ ولی اللہ دہلوی نثر میں ایسے ہوئے ہیں جن کے نام دوسرے اسلامی ملکوں کے ارباب فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ بے تکلف لیے جا سکتے ہیں۔

حماسۂ ابو تمام جو عربی شاعری کا صحیفہ ہے ہندوستان میں مولانا فیض الحسن صاحب سہارن پوری المتوفی ۱۸۸۷ء م ۱۳۰۴ھ سے پہلے نامعلوم تھا۔ ان کے زمانے میں یہ کتاب درس میں داخل ہوئی اور مدرسوں میں عام ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مولانا فیض الحسن صاحب اور اُن کے شاگردوں میں مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی وغیرہ نے عرب کے ذوق کو ہندوستان میں زندہ کیا۔

فلسفہ ومنطق کا آغاز گو ہندوستان میں پہلے سے تھا، لیکن سکندر لودھی کے عہد میں شیخ عبداللہ تلنبی اور مولانا عزیز اللہ سنبھلی کے دم سے ان کا رواج ہوا۔ یہ دونوں بزرگ ملتان سے ادھر آئے تھے۔ اس سے پہلے منطق میں شرح شمسیہ اور علم کلام میں شرح صحائف کے سوا کچھ اور نہ پڑھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے یہاں معقولات کو فروغ دیا۔ شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانے میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور میرزاہد ہروی نے منطق وفلسفہ کا درس عام کیا اور انھیں دونوں کے تلامذہ سے شاہ ولی اللہ اور فرنگی محل اور خیرآباد کی درسگاہوں میں متاخرین کے معقولات اور شروح وحواشی کی بہار آئی۔ حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ کے شاگرد ملا عبدالسلام لاہوری اور ان کے شاگرد ملا عبدالسلام اَوَدھی، ان سے ملا قطب الدین سہالوی اور ملا قطب الدین سہالوی سے ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا امان اللہ بنارسی اور قاضی محب اللہ بہاری نے اور ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بنارسی سے پڑھا۔ ملا نظام الدین کے وارث ملا بحرالعلوم ہوئے۔ بحرالعلوم سے خیرآباد کا علمی خاندان چلا۔ میرزاہد کا فیض شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی کو اور اُن سے شاہ ولی اللہ صاحب کو، اُن سے شاہ عبدالعزیز صاحب کو پہنچا اور اُن سے ملک میں عام ہوا۔

متاخرین کی ان شروح وحواشی نے اصل فن کا خون کر دیا۔ چنانچہ اس عہد کی دماغی پیداوار زیادہ تر لفظی مباحث، اعتراضات، شکوک اور ردوبدل ہیں۔ اس دور میں اسلامی علوم فنون میں سوائے نقل وتقلید اور بحث ومناظرہ کے ایک ذرہ اضافہ نہیں ہوا۔ اس دور کے مستثنیات میں حافظ ابن حجر عسقلانی، امیر اسمٰعیل یمانی

صالح بن مہدی مقبلی یمانی، ابن خلدون مغربی، مقریزی مصری، شاہ ولی اللہ دہلوی اور بحرالعلوم فرنگی محلی ہیں۔ کچھ اور بھی نام ہوں گے، مقصود استقصاء نہیں۔

اسلامی علوم و فنون کا اصلی سرمایہ وہی ہے جو قدماء نے ہمارے لئے ترکہ چھوڑا اور جس کو ہمارے بزرگوں نے سینوں سے لگا کر رکھا۔ اس کارنامے کو فخراً بیان کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے علوم و فنون پر جتنا تحریری سرمایہ دنیا کو دیا اور جس طرح کتب خانوں میں ان کو محفوظ رکھا اس میں کوئی دوسری قوم ان کی برابری نہیں کر سکتی۔ جس کثرت سے اسلامی ملکوں میں کتابیں لکھی گئیں اور کتب خانے قائم ہوئے، وہ اس خزاں کے دور میں بھی بہار کے موسم کا پتا دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے زمانے میں نہ تو چھاپے خانے تھے اور نہ ریل اور ڈاک کی آسانیاں تھیں، پھر بھی اہل شوق کی کوششوں سے "وراقین" و "وراقۃ" کے ذریعہ سے ہر کتاب کے اس کثرت سے نسخے فراہم ہوتے تھے کہ آج بھی اس سے حیرت ہوتی ہے۔ کتاب مشرق کے ایک گوشہ میں لکھی جاتی تھی اور چند روز میں مغرب کے دوسرے گوشہ میں پہنچ جاتی تھی۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ابوالفرج اصفہانی المتوفی ۳۵۶ھ کی کتاب الاغانی لکھی تو مشرق میں گئی اور سیف الدولہ ہمدانی کو ہدیہ دی گئی۔ مگر اس کا سب سے پہلا نسخہ اسپین کے خلیفہ حکم المتوفی ۳۶۶ھ کی خدمت میں پیش ہوا اور خلیفہ اس اولیت پر فخر کرتا تھا۔

ہندوستان کا یہ کارنامہ فخر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شاہجہانی عصر کے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے علم کلام و معقولات پر جو شروح و حواشی لکھے وہ لکھے تو ہندوستان میں، مگر اُن کی نقلیں عثمانی سلاطین کے پاس تحفۂ شاہی کے طور پر قسطنطنیہ جاتی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی تصانیف قسطنطنیہ سے شائع ہوئیں۔

اسلامی علوم و فنون کی کتابوں پر تین سب سے بڑے سخت وقت گزرے ہیں جن میں بزرگوں کا بڑا اندوختہ تلف ہو گیا یا اخلاف کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ سب سے پہلا وقت تو وہ ہے جب ساتویں صدی میں چنگیز خان اور ہلاکو کے ہاتھوں سے خراسان

اور بغداد کے کتب خانے تباہ ہوئے۔ دوسرا وقت وہ تھا جب نویں صدی میں اسپین میں اسلامی حکومتوں کا خاتمہ ہوا اور تیسرا وقت وہ ہے جب موجودہ یورپ کی تعدی نے اسلامی علوم و فنون کے ذخیروں پر پہلے فوجی قبضہ کر کے، پھر خرید خرید کر یورپ کے کتب خانوں میں منتقل کر دیا، جو کچھ اس وقت ہمارے پاس ہے وہ یا مصر کے سرکاری کتب خانے میں، یا دمشق یا حلب کے بعض کتب خانوں میں یا قسطنطنیہ کے موقوفہ کتب خانوں میں ہے۔

حرمین میں جو کتابیں تھیں وہ گزشتہ فتنہ میں تباہ ہوئیں، مدینۂ منورہ میں گو کئی کتب خانے ہیں مگر متولیوں کی غفلت سے تباہ و برباد ہیں۔ صرف دو کتب خانے ذکر کے قابل رہ گئے ہیں، ایک شیخ الاسلام کا کتب خانہ جس کی نادر کتابیں ترکوں نے مدینہ چھوڑتے وقت شام میں منتقل کر دیں اور شام کے تخلیہ کے وقت وہ صندوقوں میں بھری ہوئی تلف ہو رہی تھیں کہ کتب خانہ کے ترک متولیوں اور امیر فیصل کی کوششوں سے جو بچیں وہ واپس آسکیں۔ دوسرا وہاں کا کتب خانہ مدرسۂ محمودیہ کا کتب خانہ ہے جو سلطان محمود خاں عثمانی کی یادگار ہے، اس کتب خانہ کو ۱۹۲۶ء میں جب میں نے دیکھا تو یہ حال تھا کہ بڑی مشکل سے متولیوں نے اس کے بند دروازوں کے قفل کھولے لیکن فہرست میں دیکھ کر جس نادر کتاب کو مانگا معلوم ہوا کہ ترک اس کو اپنے ساتھ لے گئے۔

ابھی اس بڑی جنگ کے بعد جب عراق انگریزوں کے ہاتھ آیا، دجلہ و فرات کی روانی انگلش چینل کی موجوں میں مل گئی اور کتابیں یورپ کے کتب فروشوں کی دکانوں میں بہ بہ کر آنے لگیں۔ کہتے ہیں کہ اسپین کا بچا کھچا سرمایہ اسکوریال لائبریری میں ہے، اور ایشیائے وسطیٰ کا ذخیرہ روس کے کتب خانوں میں منتقل ہو گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں لکھنؤ اور دلی کے شاہی کتب خانوں پر جو آفتیں آئیں وہ مورخوں کی نگاہوں سے اب تک پوشیدہ ہیں اور شاید ہمیشہ کے لئے رہیں۔ کچھ حصہ تو انگلستان کو منتقل ہو گیا کچھ فوجی افسروں اور سپاہیوں میں بٹ گیا، پھر اُنھوں نے قدردانی سے انگلستان کے قومی کتب خانوں کے سپرد کر دیا یا نج کے طور پر

بیچ ڈالا اور کتابیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں اور اب بھی اس قسم کے مال غنیمت کا پتا یورپ کے کتب خانوں میں ملتا ہے۔

جرمن ڈاکٹر اسپرنگر نے جو اس زمانہ میں بعض سرکاری عربی مدرسوں کے انچارج تھے اور جنھوں نے اودھ کے شاہی کتب خانوں کی فہرست تیار کی تھی، اس قسم کے سرمایہ کو بڑی حفاظت سے اپنے ملک میں پہنچا دیا۔ اودھ کے سرکاری کتب خانہ کی کتابیں آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔

اودھ کے شاہی کتب خانوں کی تباہی کی پُر درد کہانی مولانا شبلی مرحوم نے ایک چشم دید گواہ مشہور فارسی شاعر خواجہ عزیز الدین لکھنوی کی زبانی مجھ سے بیان فرمائی تھی۔ خواجہ صاحب کہتے تھے کہ فرنگی محل کے پل سے لے کر نخاس تک کتابوں کا اتنا ڈھیر بکھرا ہوا تھا کہ آنے جانے والے کتابوں کو روندکر آتے جاتے تھے اور سنا ہے کہ گورنمنٹ نے ان کو نیلام کر دیا اور کتابیں ردی کے بھاؤ بکیں۔ بہر حال اتنا شکر ہے کہ بریلی سے حافظ الملک رحمت خاں اور لکھنؤ سے شاہان اودھ کی کچھ کتابیں رام پور چلی گئیں جو آج تک وہاں کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ لکھنؤ میں مولوی ناصر حسین صاحب کے خاندانی کتب خانے کی بنیاد بھی لکھنؤ کے شاہی کتب خانوں کی غارت شدہ کتابوں سے پڑی۔ اس زمانہ میں خان بہادر مولوی مفتی محمد قلی خاں موسوی نیشاپوری کنتوری المتوفی ۱۲۶۰ھ صدر الصدور تھے، انھوں نے غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی نیلام کی ہوئی کتابیں خرید لیں۔ ٹونک کا سرمایہ بھی غنیمت ہے جو وہاں کے ایک عالم رئیس کی محنت کا نتیجہ ہے۔

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے اس افراتفری کے زمانے کے بعد کتابوں کو خریدنا شروع کر دیا اور اس طرح اچھا خاصہ ذخیرہ ہندوستان کے اندر رہ گیا، تاہم اس کے ایجنٹ مولویوں کو یہ واقعہ ہے کہ نادر کتابوں کو کوڑیوں کے مول خریدنے اور یورپ اور امریکہ کے شائقوں کے ہاتھوں بیچنے کا چسکہ پڑا اور یہ کاروبار اب تک جاری ہے۔

نواب عماد الملک مرحوم کا یہ کارنامہ بھلانے کے لائق نہیں کہ انھوں نے سرکار آصفیہ کو

ان پراگندہ موتیوں کو اپنے خزانۂ عامرہ میں بحفاظت جمع کرنے کی توجہ دلائی اور کتب خانۂ آصفیہ کا وجود ہوا جس کی بدولت دکن کا بڑا سرمایہ محفوظ رہا۔ دوسری طرف پٹنہ کے مولوی خدابخش خاں مرحوم نے اپنی ساری کمائی کو انھیں جواہرات کے خریدنے اور جمع کرنے میں خرچ کر ڈالا اور آج پٹنہ کا مشرقی کتب خانہ ہندوستان میں اسلامی علوم فنون کی یادگاروں کا نادر مرقع ہے۔

علی گڑھ بھی ایک ایسے ہی شائق رئیس بن رئیس کا مسکن ہے جن کے حبیب گنج میں لکھنؤ، لاہور، دلّی اور دکن کے انمول تحفے ہیں۔

کتابیں کہاں سے کہاں اور کیوں کر پہنچیں؟ ان کی دو دلچسپ کہانیاں آپ کو سناتا ہوں۔ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید کا ایک عمدہ قلمی نسخہ ہے اس کے پہلے صفحہ پر اس کی جو سرگزشت مختلف مالکوں کے قلم سے ثبت ہے وہ یہ ہے کہ یہ نسخہ کوئی ایرانی فاضل میر صفی الدین ۱۰۱۳ھ میں کسی بادشاہ کے لئے ہدیہ لائے، پھر ۱۰۲۱ھ میں محمد قلی قطب شاہ والی دکن کے کتب خانہ کی ملکیت ہوا۔ پھر کوئی امیر الدولہ عماد الملک اس کے مالک بنے۔ اس کے بعد ۱۱۹۴ھ میں وہ کسی طرح شمس الدولہ منیر الملک مسٹر ہنری ونسٹرٹ بہادر تہور جنگ کے قبضہ میں آیا۔ اس سے ۱۱ رمئی ۱۷۸۶ء کو وہ کسی انگریز بوڈم کے قبضہ میں کلکتہ آیا۔ وہاں سے محمد آباد ضلع اعظم گڈھ کے علم دوست رئیس ڈپٹی مولوی عبدالغفور صاحب مرحوم کی ملکیت بنا اور اب وہاں سے وقف ہو کر دارالمصنفین کے کتب خانہ میں آیا ہے۔

زیب النساء بنت عالمگیر کے دربار کے عالم معین بن ولی قزوینی جنھوں نے شہزادی کے حکم سے امام رازی کی تفسیر کبیر کا ترجمہ فارسی میں زیب التفاسیر کے نام سے کیا تھا۔ ۱۰۸۷ھ میں شہزادی کی اجازت سے حج و زیارت کو حرمین گئے تھے۔ اس مقدس سفر کی یادگار میں انیس الحجاج نام ایک مختصر کتاب لکھی تھی۔ جس میں بڑا حصہ سفر کے حالات کا اور کچھ مناسک حج کا ہے، اس میں بندر سورت، مخا جدہ اور امیر مکہ شریف برکات اور ترکی والی اور محمل وغیرہ کے جلوسوں کی قلمی تصویریں ہیں۔

اس کا ایک ناقص حصہ برٹش میوزیم لائبریری میں ہے۔ اسپرنگر نے اودھ کے شاہی کتب خانہ میں اس کے ایک ایسے نسخہ کا ذکر کیا ہے جو کسی دوسری کتاب کے ساتھ ایک جلد میں شامل تھا اور اس کے اوراق کچھ غیر مرتب تھے اور جس میں تصویریں تھیں ابھی حال میں ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ کو اس کا ایک نسخہ مونگیر کے ایک دیہات سے دار المصنفین کے کتب خانے میں خریدا گیا جس پر گو مہریں نہیں تاہم اسپرنگر کے بیان کا حرف حرف صادق آتا ہے اور تعجب ہے کہ کہاں اودھ کا شاہی کتب خانہ اور کہاں مونگیر کا ایک دیہات۔ شاہی کتب خانوں کی اکثر کتابوں کی یہ انقلابی تاریخ ہر بڑے کتب خانے کے نسخوں کی لوح پر ثبت نظر آتی ہے۔

بہرحال ہر شر میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے ؎

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

اسلامی مفتوحہ ملکوں سے یورپ کو جو کتابیں منتقل ہوئیں ان کا کم از کم یہ نتیجہ نکلا کہ وہ ناقدر غافل اولادوں کے قبضہ سے نکل کر قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچیں اور کیڑوں کی خوراک بننے سے بچ گئیں۔ ان کی ترتیب ہوئی، درستی ہوئی اور ان کی حفاظت کی تدبیریں ہوئیں، ان کی فہرستیں بن کر چھپیں اور اہل علم کو ان کا علم ہوا اور ان سے فائدہ اٹھایا جاسکا۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ یورپ کے مشرقی علوم کے فاضلوں نے ان میں سے بہت سی کتابوں کو پڑھکر ان کی دقتوں کو حل کر کے ان کی تصحیح و تعلیق کر کے بہت عمدگی کے ساتھ ان کو چھاپ کر شائع کیا اور ہر صاحب علم کے لئے ان سے نفع اٹھانا ممکن ہوا اور اس سے اسلامی علوم و فنون کی تحقیق میں بہت بڑی مدد ملی۔ آج ان کی اس محنت کی بدولت اسلامی تاریخ، طبقات، جغرافیہ، ادب، شعر، لغت، فلسفہ، کلام، ہیئت، کیمیا اور بہت سے علوم کے متعلق اتنی کتابیں ہر شخص کے دسترس میں آگئیں جو اس سے پہلے قطعاً نہ تھیں۔

جس محنت سے ڈوزی نے اپنا ضمیمہ لغات عربی میں ترتیب دیا، سخاؤ نے کتاب الہند کی

تصحیح کی، دی گوئی نے تاریخ طبری کو، مرگلیوتھ نے طبقات الادبا یاقوت کو فلوگل نے ابن ندیم کی فہرست کو، مزیک نے خوارزمی کے جغرافیہ کو چارلس ہنری میاس میکارٹنی نے ذوالرمہ کے دیوان کو بیوان نے نقائض جریر و فرزدق کو، رڈلف گیر نے اعشیٰ کے دیوان کو، ریٹر نے امام اشعری کی مقالات الاسلامیین کو اور مختلف مستشرقوں نے سیکڑوں کتابوں کو سالہا سال کی جس محنت، جاں فشانی اور کوشش سے تلاش و محنت اور تصحیح و مراجعت کے بعد چھاپ کر شائع کیا وہ ہر مسلمان کی منت پذیری اور سپاس گزاری کے قابل ہے۔

مدت دراز سے انسائکلوپیڈیا آف اسلام کے نام سے اسلامی علوم و فنون کا قاموس تیار ہو رہا ہے اور اس سے بڑھکر یہ کہ ونسنک کی کوشش سے ہماری احادیث کی ضخیم فہرست بہ ترتیب تہجی بن رہی ہے۔ غور کے قابل ہے کہ یہ کام کس کے کرنے کا تھا اور کون کر رہا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ قدم قدم پر ان سے ان امور میں جو مسلمانوں کے مذہب، تاریخ اور تمدن سے متعلق ہیں، لغزشیں ہوئی ہیں، خواہ ان کو دانستہ تعصب کہئے یا نادانی کی غلطی، ہر حالت میں نتیجہ ایک ہے یعنی ان کی تحقیقات بہت حد تک مسلمان نوجوانوں کی گمراہی کا باعث بنتی ہیں۔ یہی ونسنک صاحب ہیں جو حدیثوں کی فہرست بنا رہے ہیں۔ وہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں نماز پر ایک مضمون لکھتے ہیں اور موطا کی سب سے پہلی حدیث کتاب الوقوت کا غلط مطلب سمجھکر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک اسلام میں پانچ وقتوں کی نمازوں کا تعین نہیں ہوا تھا، مارگولیوتھ لائف آف محمد میں اللہ کو اللات سے اور مسلم کو مسیلمہ کذاب سے اور دین حنیف کو قبیلہ بنی حنیفہ سے مشتق کرتے ہیں۔ وکانوا یعبد ونہما کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ:

"حضرت محمد رسول اللہ صلعم اور حضرت خدیجہؓ سونے سے پہلے لات اور عزیٰ کی پوجا کیا کرتے تھے۔"

نولڈیکی نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع ۱۳ میں قرآن پاک پر جو مضمون لکھا ہے وہ حد درجہ گمراہ کن ہے اور اہل علم کے لئے مضحکہ خیز اور اعتراضات سے لبریز ہے۔ یغاث الناس کا

ترجمہ غیث سے بے کر یہ ارشاد ہے کہ قرآن کے مصنف کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ مصر کی سیرابی آسمانی بارش سے نہیں ہوتی بلکہ دریائے نیل سے ہوتی ہے۔ سینا کی جمع وطور سینینین میں صرف قافیہ پیمائی کی ہے اور یہ بھول گئے کہ عبرانی تورات میں اس کو سینا یم جمع کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ علیہا تسعۃ عشر کی نسبت ارشاد ہے کہ صرف قافیہ کے لیے یہ تعداد ہے مگر یہ نہ سوچا گیا کہ احد عشر سے تسعۃ عشر تک قافیہ تو یکساں ہو سکتا تھا پھر تسعۃ عشر کو ان میں سے منتخب کرنا ظاہر ہے کہ کسی اور حقیقت پر مبنی ہے۔ سرولیم میور حضرت حسان کے اس مصرع کا وتصبح غرثیٰ من لحوم الغوافل جو حضرت عائشہؓ کی مدح میں ہے یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ اس میں شاعر نے حضرت عائشہؓ کے دُبلے پتلے اور چھریری ہونے پر طنز کیا ہے۔ حالانکہ شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتیں۔

غرض مستشرقین نے عموماً اسلامی مباحث میں جہاں ذرا بھی اسلام، قرآن اور سیرت نبوی کا تعلق آیا ہے دانستہ یا نادانستہ طور سے افسوس ہے کہ سچائی کا بڑی بے دردی سے خون کیا ہے اور چونکہ وہ محققانہ انداز اور سلیقہ سے اثنائے تحقیقات میں بظاہر بلا ارادہ اس قسم کی باتوں کو لکھ جاتے ہیں اس لئے مسلمان ناظرین اور طالب علموں کو بہکنے اور بھٹکنے کے پے درپے موقع آتے رہتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ؎

قاصد رقیب بودہ و من غافل از فریب

بیدرد مدعائے خود اندر میانہ ساخت

ابھی چند سال کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان پی ایچ ڈی نے حضرت ابن عباس کی نسبت ایسے مکروہ الفاظ لکھے کہ ہر مسلمان کو تکلیف روحانی ہوئی اور اس پر کمال یہ ہے کہ وہ اس کو اسلام کی خدمت سمجھے اور میں نے سُنا ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ابن عباس کون ہیں اور اسلام اور پیغمبر اسلام سے ان کا کیا رشتہ ہے ؎

زنا دانی برادر کرد ہمدم کارِ من ضائع

عجب تر ایں کہ بر من منتِ بسیار ہم دارد

یہی سبب ہے کہ اُن مسلمان طلبہ کی نسبت جو اسلامی علوم و فنون کی تکمیل و تحقیق

کے لئے یورپ جاتے ہیں۔ یہ فیصلہ مشکل ہے کہ وہ کیا بن کر آئیں گے۔ یورپ کے اُستادوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کے شاگرد مذہب سے خالی ہو کر اسلامی علوم وفنون کی تحقیق ان کی عینک لگا کر کریں۔ لیکن جب کسی مسئلہ سے مذہبی ہمدردی کا پہلو منفی ہو جاتا ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے خیال کے ہر جذبہ سے پاک ہو گیا۔ انسان جب تک انسان ہے وہ جذبات کی سخت زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر وہ مذہبی جذبہ سے آزاد ہو گا تو دوسرے جذبات کا اسیر ہو جائے گا اور یہی مرحلہ ہر مستشرق کو بلکہ ہر محقق کو ہر قدم پر پیش آتا ہے۔ اس لئے مسائل کی تحقیق میں قومی اور مذہبی جذبہ سے عریانی کی کوشش کے بجائے صحیح استدلال، صحیح استنباط اور صحیح نقطۂ نظر کی تلاش کا خوگر ہونا چاہیئے۔

عام طور سے ہمارے نوجوانوں کا رجحان یورپ کے فضیلت کدہ سے کسی کاغذی سند اور کسی حرف تہجی کے لقب کے حصول کی طرف ہے۔ حالانکہ اسلامی فضل وکمال کا حصول اس راہ سے قطعاً غلط ہے۔ اتنا صحیح ہے کہ یورپ کے کتب خانوں میں کتابوں کے جو نادر مجموعے ہیں ان کا ملنا آسان ہے۔ اور یورپ کے محققوں نے زیر بحث مسئلہ کی نسبت حق یا باطل جو کچھ لکھا ہے وہ سارا مواد سامنے رہتا ہے اور وہاں کے مشرقی علوم کے استادوں کے مطالعے اور مشورے سے تحقیق کی راہ معلوم اور طریقۂ کار کی مشق ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ ہماری ذہنی غلامی ہم کو غلط راستہ پر نہ لے جائے اور اس سیلاب میں ہمارے مذہبی عقائد اور قومی مقاصد کو صدمہ نہ پہنچے۔

یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو نوجوان کامیابی کے بعد یورپ سے لوٹتے ہیں مشرقی درسگاہوں کے قانع العلم علماء کی طرح یہ بھی یورپ سے لوٹ کر اور کوئی اچھی جگہ پا لینے کے بعد جو اصل اس دوڑ دھوپ کا اصلی مقصد ہوتا ہے یہاں کی آب وہوا میں ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں اور اپنے علمی مشاغل کو جاری نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ ہر ایک کا حال ایسا نہیں، مستثنیات بھی ہیں مگر اکثریت کا یہی حال ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مشرق میں بھی ایسے علما پیدا ہو گئے ہیں جو یورپ کے

طریق پر اسلامی علوم و فنون کے مختلف موضوعات پر عمدہ تحقیقات میں مصروف ہو رہے ہیں۔ مصر میں احمد ذکی پاشا، تیمور پاشا۔ شام میں کرد علی اُستاذ مغربی اور امیر شکیب ارسلان وغیرہ کے نام نامی اعزاز کے مستحق ہیں۔ دمشق میں المجمع العلمی العربی اور مصر میں المجمع العربی اللغوی کی کوششیں علم و فن کی تحقیقات میں ترقی کا باعث ہیں۔

ہندوستان بھی اس راہ میں اپنا حق ادا کرنے لگا ہے، مولانا شبلی مرحوم اس ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے یورپ کے طرز پر جدید ضروریات اور مباحث کو پیش نظر رکھکر اپنی تحقیقات ملک میں پیش کیں اور مشرق و مغرب نے ان کی نکتہ سنجی کی داد دی۔ ۱۹۰۸ء سے جب انگریزی گورنمنٹ نے مشرقی علوم و فنون کی تکمیل کی غرض سے یورپ جانے کے وظیفہ مقرر کئے، نئے تعلیم یافتہ اشخاص میں بھی مشرقی علوم کی تحصیل و تکمیل کا شوق پیدا ہوا اور مشرقی علوم کے کئی بہتر فضلاء ہمارے ملک میں پیدا ہوئے، جن میں سے ڈاکٹر عظیم الدین، پٹنہ۔ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی الہ آباد۔ پرنسپل محمد شفیع اور محمد اقبال لاہور۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آباد۔ ذکر کے قابل ہیں۔

اس سے زیادہ فخر کے قابل یہ ہے کہ کئی اصحاب نے صرف اپنی کوشش اور محنت سے ذوق اور شوق پیدا کیا اور ان کا درجہ یورپ کے اچھے اچھے لوگوں کے مقابلے میں ہے۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی لاہور۔ مولانا محمود حسن خاں صاحب ٹونک، پروفیسر میمن عبد العزیز۔ علی گڑھ۔ مولوی سید ہاشم صاحب ندوی حیدر آباد۔ مولوی ابو الوفا صاحب قندھاری۔ حیدر آباد کی کوششیں ہماری شکریہ کی مستحق ہیں۔

پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی ناقدانہ نظر مسلّم ہو چکی ہے اور یہ بے تامل کہا جاسکتا ہے کہ قدیم کتابوں، سکوں اور خطوط کی دریافت میں ان کا پایہ بہت اونچا ہے۔ مولانا محمود حسن خاں صاحب اسلاف کی نادر تصانیف اور مصنفین کے احوال و سنین میں بڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی ضخیم تالیف "معجم المصنفین" جب چھپ کر

منظر عام پر آجائے گی اسلامی ہندوستان کا بڑا کارنامہ سمجھی جائے گی۔ پروفیسر میمن عبدالعزیز صاحب کی ادبی ولغوی واخباری تحقیقات اور نوادر کتب اور اسمار الرجال کی یادداشت سلف کا نمونہ ہے۔ مولوی سید ہاشم صاحب ندوی ناظر دائرۃ المعارف حیدرآباد نے ہندوستان کے کتب خانوں کو چھان ڈالا ہے اور نوادر کتب کی تحقیقات کی ہے اور مسلمانوں کے فن تعلیم پر ایک عمدہ کتاب "تذکرۃ السامع والمتکلم" لابن جماعہ کو تصحیح وتحشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مولوی ابوالوفا صاحب قندھاری معتمد معارف نعمانیہ۔ حیدرآباد۔ قدیم ائمہ فقہ کی تصانیف کی تلاش میں ہندوستان، مصر اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے عجیب عجیب چیزیں منگوائی ہیں اور ابھی اسی مہینے میں قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الآثار کو تصحیح وتحشیہ و مراجعت کے بعد مصر سے شائع کیا ہے۔ ابھی اسی سال امالی قالی کی شرح للوزیر ابی عبید البکری اندلسی کا جو نسخہ پروفیسر میمن عبدالعزیز کی تصحیح اور تحشیہ سے چھپا ہے اور اس پر ان کے قلم سے جو باقی ذیل اور شرح تصنیف پائی ہے وہ ہر لحاظ سے مدح اور توصیف کی مستحق ہے۔ اسی طرح گزشتہ سال پرنسپل محمد شفیع لاہور نے تاریخ حکمار اسلام میں بیہقی کی تتمہ صوان الحکمۃ جس وسیع مطالعہ و تحقیق اور مراجعت کے بعد شائع کی ہے وہ آئندہ کے لئے فال نیک ہے۔ اسی طرح مولوی بدرالدین صاحب علوی علی گڑھ نے بشار کا جو دیوان تصحیح وتحشیہ کے ساتھ تیار کیا ہے اور مصر کی مجلس نشر و تالیف نے شائع کیا ہے وہ علما کے لئے نمونہ ہے۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد۔ اس سلسلہ میں جو کچھ کر رہی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اس راہ میں جو کچھ کر رہا ہے اور اپنی بائیس برس کی زندگی میں اسلامی علوم وفنون کے مختلف عنوانوں پر پچاس سے زیادہ جو کتابیں شائع کی ہیں اُن کی نسبت میں کچھ کہہ کر بوڑھے سعدی کا یہ طعنہ سننا نہیں چاہتا کہ "مشک آنست کہ خود بوید، نہ کہ عطار بگوید"۔

ادھر اس بڑی لڑائی کے بعد سے مصر اور شام اور ایران میں بھی قدما کی

نئی کتابوں کی اشاعت ترقی پزیر ہے۔ ایران سے ابھی محاسن اصفہان اور تتمہ یتیمۃ الدہر ثعالبی وغیرہ عمدہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ مصر کی ہر ڈاک سے کسی نہ کسی عمدہ کتاب کی اشاعت کی خبر آتی رہتی ہے اور اس کثرت سے یہ سرمایہ بڑھ رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین نے اپنا سارا خزانہ اُگل دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

لیکن افسوس اس کا ہے کہ جس کثرت سے سفینے معمور ہو رہے ہیں سینے خالی ہو رہے ہیں، آنکھوں کا نظارہ بڑھ رہا ہے، لیکن دل و دماغ کا تماشا کم ہو رہا ہے۔ عربی مدرسوں کی تعلیم یافتوں کی ہمتیں اتنی قاصر ہیں کہ درسیات سے آگے ان کی نظر نہیں اُٹھتی اور مغربی تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں علم الکتب (ببلیوگرافی) کی سطح سے آگے بڑھکر معانی و مطالب کے مغز تک رسائی کا شوق بہت کم ہے۔ حالانکہ زمانۂ حال کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے متروکات میں اگر اضافہ نہ کر سکیں تو کم از کم ان کو جوں کا توں باقی تو رکھیں۔ بقاے اصلح کے اصول سے دنیا کی کوئی چیز بری نہیں۔ ہر وہ چیز جس کو زمانہ کے مذاق اور پسند کے مطابق بنا کر دکھایا نہ جائے گا۔ لوگوں کی نگاہوں سے گر جائے گی، اور پھر عجب نہیں کہ وہ برباد ہو جائے۔

اسلامی علوم و فنون کا جو سرمایہ اب بھی ہمارے سامنے ہے وہ اتنا کچھ ہے کہ اگر ہم ان کو سلیقہ سے ترتیب دیں اور ان کو مناسب شکل و صورت میں اہل زمانہ کے سامنے پیش کریں تو وہ ان کی مناسب قدر و منزلت کے لئے تیار ہیں۔ اب تک مسلمانوں کی سائنس، فلسفہ، کیمیا، مناظرہ، ریاضیات اور فلکیات کے متعلق بہت کم کام ہوا ہے۔ ہمارے عربی مدرسوں میں روز بروز ان کی تعلیم کم ہوتی جاتی ہے اور نئے تعلیم یافتہ زیادہ تر ادب اور تاریخ کے موضوعات میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان ان علوم کی تحقیقات میں مصروف ہوں اور لوگوں کو بتائیں کہ ان علوم میں ہمارے بزرگوں کا کیا پایہ تھا۔

بعض نئے علوم جیسے اقتصادیات یا معاشیات یا علم السیاستہ پر ہمارے ہاں گو مستقل فن کی حیثیت سے کتابیں نہیں لیکن اگر کوئی ذرا محنت کرے تو مختلف فنون سے

ایسے مواد پا سکتا ہے جن کو ترتیب دے دیا جائے تو ان علوم کا ہیولیٰ بھی تیار ہو جائے چنانچہ ہندو نوجوانوں اور فاضلوں نے ادھر توجہ کی تو اپنے ہاں سے ایسی چیزیں بنا کر پیش کی ہیں جن سے ان کے علوم کی قدر و قیمت بڑھی، ان کے قومی وقار میں اضافہ ہوا اور زندہ قوموں نے ان کی اولیت کو تسلیم کیا۔

اس قسم کی کوششیں چونکہ غیروں نے کم اور ہم نے بالکل نہیں کی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علوم کی تاریخ میں مسلمانوں کی محنتوں کا ذکر گویا بالکل نہیں آتا یا بہت کم آتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قدیم یونانی و ہندی علوم اور موجودہ مغربی تحقیقات کے درمیان مسلمانوں کا ہزار سالہ عہد، ہر علم کی ترقی کی تاریخ میں اصول ارتقا کے بموجب درمیانی زینہ ہے۔ اس درمیانی زینہ کو چھوڑ دینے سے قدیم و جدید کے درمیان ایک خلا محسوس ہوتی ہے، جس کو برابر کرنا اور بھرنا خود ہمارا کام ہے۔

مسلمانوں کی سائنٹفک تحقیقات اور اسلامی سائنس اور طبیعیات پر ابھی کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ درسیات میں طبیعیات کا جو کچھ حصہ شامل ہے وہ یونانیوں کی صدائے بازگشت اور افسانہ کے سوائے کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ اگر ابو یعقوب کندی نظام، ابن ہیثم، خازنی، ابن سینا، خیام، ابوریحان بیرونی، زکریا رازی، ابو البرکات بغدادی اور امام رازی وغیرہ کی تصانیف اور اقوال و آرا، کے اقتباسات جمع کئے جائیں تو مسلمانوں کا اپنا پورا علم طبیعیات تیار ہو سکتا ہے، اگر کوئی شرح مواقف ہی سے خاص مسلمانوں کے طبعی مسائل جمع کرے تو ایک رسالہ ہو جائے۔

فلسفہ میں مسلمانوں کا پایہ صرف اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ "ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے" اس کا سبب یہ ہے کہ متاخرین کی کتابوں میں اسکندریہ کے یونانی اسکول کی آواز بازگشت کے سوائے اور کچھ نہیں۔ دوسری اور تیسری صدی میں مسلمان حکما نے جو کچھ کیا وہ علم کلام کا حصہ ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ حقیقت میں اسلامی فلسفہ کا اصلی دور یہی تھا، اگر اس زمانہ کی تصانیف اور آراء کو مذہبیات سے الگ کر کے خاص فلسفہ کی نظر سے دیکھا جائے اور پھر فارابی، ابن سینا۔ مصنفینِ اخوان الصفا، امام غزالی،

شیخ الاشرق سہروردی مقتول، عبدالکریم شہرستانی، فخرالدین رازی، عین القضاۃ ابوالمعالی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، ابن تیمیہ حوانی، ابن خلدون، مجددالف ثانی شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو اسلامی فلسفہ کے متعدد اسکولوں کے نظریئے قائم ہو جائیں۔

یعقوب کندی کے بعض طبیعاتی رسالے ہندوستان میں موجود ہیں۔ ابن تیمیہ کی عجیب و غریب کتاب الرد علی المنطقیین جس کو حقیقت میں پرانی منطق پر بہترین تبصرہ اور نئی منطق کی بنیاد کہنا چاہیئے اس کا اصل نسخہ ہندوستان ہی کی ملک ہے۔ ابوریحان بیرونی کی قانون مسعودی جو مسلمانوں کے جغرافیۂ فلکی کی معیاری کتاب ہے ہماری سی سالہ کوششوں کے باوجود حلیۂ طبع سے محروم ہے۔ خازنی کی کتاب میزان الحکمۃ کا سب سے پرانا اور بہترین نسخہ جامع مسجد بمبئی میں کیڑوں کی نذر ہو رہا ہے اور اس کا ایک چھوٹا سا حصہ امریکہ کے مشرقی مجلس کے رسالہ میں خانکوف نے چھاپا تھا۔ مگر مکمل کتاب ابھی تک نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہ کتاب اگر کسی فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ چھپ جائے تو مسلمانوں کی طبیعات کی تاریخ میں انقلاب ہو جائے۔ مسلمانوں کے فن جنگ پر ایک عمدہ کتاب کتب خانۂ آصفیہ میں ہماری توجہ کی منتظر ہے۔

اس سلسلہ میں یہ خبر مسلمان اہل علم کے حلقہ میں خوشی کے ساتھ سنی جائے گی کہ دائرۃ المعارف حیدرآباد امام رازی کی مباحث شرقیہ کے بعد ابوالبرکات بغدادی کی الکتاب المعتبر چھپوا رہا ہے۔ جس کی نسبت اہل نظر کی یہ رائے رہی ہے کہ وہ یونانی فلسفہ پر بہترین تنقید ہے۔

ہاں۔ ایک اہم کام ہمارے ذمہ باقی ہے کہ حکماء اسلام کے سوانح و آراء پر ایک مبسوط و محققانہ کتاب لکھی جائے، اس وقت تک ہمارے پاس قفطی کی مختصر کتاب کے سوائے اس موضوع پر کچھ نہ تھا۔ پرنسپل محمد شفیع ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پوری کوشش اور محنت سے ظہیرالدین بیہقی کی تتمہ اور اس کے فارسی ترجمہ کو شائع کر دیا۔ اب اتمام اور شہرزوری کی تاریخ الحکماء اور باقی ہیں جن میں

کچھ کچھ تتمہ پر اضافے ہیں، لیکن ان کتابوں میں بھی شروع سے لے کر اخیر تک کے حکمار کا استقصاء نہیں۔ پھر وقایع وسنین عموماً مذکور نہیں۔ تصانیف کی پوری فہرست نہیں اور حکیمانہ اقوال کے سوا ان کے فلسفیانہ خیالات اور نظریوں سے کچھ بحث نہیں۔ ضرورت اس موضوع پر ایک جامع اور مکمل تصنیف کی ہے۔

یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ خیر ان عقلی علوم کی طرف اگر توجہ نہیں تو مذہبی علوم کی طرف تو ہماری توجہ ہے۔ یہ خیال بھی سراسر فریب ہے۔ صحاح ستہ اور درسیات کے سوائے یہاں بھی علمی ذوق وشوق کا پارہ صفر کے درجہ پر ہے۔ درسیات سے ہٹ کر کوئی چیز نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ قوم کو دار العلوم ندوۃ العلما، کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس نے نصاب تعلیم میں تغیر وتبدل کرکے بہت سی عمدہ کتابوں سے ہمارے عربی مدرسوں کو روشناس کیا ہے۔ اب دلائل، اسرار البلاغۃ کتاب الصناعتین، کتاب البیان، عمدہ، نقد الشعر، اعجاز القرآن باقلانی کے نام آنے لگے ہیں۔

کتب احادیث کی خدمت کے لئے تمام دنیائے اسلام کو ہندوستان کا مشکور ہونا چاہیئے۔ صحیح بخاری، جامع ترمذی، ابو داؤد، صحیح مسلم وغیرہ کتابیں سب سے پہلے ہندوستان میں چھپیں۔ اخلاف کے سننے کے قابل یہ بات ہے کہ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری نے صحیح بخاری کی تصحیح وتحشیہ اور طبع میں اپنی عمر کے بیس برس صرف کئے، تب یہ لعلِ بے بہا مسلمانوں کے دامن میں آیا۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد نے احادیث اور اسماء الرجال کے نادر ذخیرہ کو چھپوا کر وقف عام کیا۔ نواب صدیق حسن مرحوم نے کتب احادیث خصوصاً فتح الباری کو شائع کرکے فن حدیث کی بڑی خدمت کی، مگر ابھی تک مصنفات اور مسانید کا بڑا حصہ اہل علم کی نگاہوں سے چھپا ہے۔ مصنف عبد الرزاق اور ابن ابی شیبہ جو آثار واخبار کا بڑا ذخیرہ ہیں، یکجا نہیں۔ ان کی تکمیل اور اشاعت بڑی اسلامی خدمت ہے۔ اسمار الرجال میں امام بخاری کی تاریخ صغیر کے سوا قدما کی کوئی اور چیز ابھی نہیں

آئی - جو کچھ ہے وہ متاخرین کا سرمایہ ہے۔ دائرۃ المعارف سنا ہے کہ تاریخ کبیر کی اشاعت کی فکر میں ہے۔ قسطنطنیہ میں امام احمد بن حنبل کی کتاب اسماء الرجال کا اور کتب خانۂ ظاہریہ دمشق میں تاریخ وعلل یحیی بن معین کا پتا چلا ہے، جو ظاہر ہے کہ اس سلسلۂ زریں کی کتنی قیمتی کڑیاں ہیں۔ لاہور میں کسی نے خوش خبری سنائی تھی کہ وہاں امام مسلم کی کتاب الافراد والوحدان چھاپنے کا تہیہ ہو رہا ہے۔ ابن حبان کی تصانیف بھی موجود ہیں مگر ابھی تک حلیہ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔

ہمارے علم ومذہب کا سب سے بڑا سرمایہ قرآن پاک ہے۔ مگر افسوس ہے کہ علوم القرآن کی طرف سب سے کم توجہ ہوئی ہے۔ اعجاز القرآن پر باقلانی کی متکلمانہ کتاب کے سوا اب تک کوئی چیز سامنے نہ تھی۔ ہمارے دوست ڈاکٹر عبد العلیم صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ یورپ کے سفر سے اس موضوع پر متعدد اچھے رسالے ساتھ لائے اور رمانی کا رسالہ چھاپ کر شائع بھی کیا ہے، میری رائے میں یہ اس وقت اس موضوع پر بہترین کتاب ہے اور اس قابل ہے کہ ہمارے عربی مدرسوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہو۔ اعراب القرآن پر عکبری کی تصنیف گو اچھی ہے مگر رام پور میں اس فن پر اس سے ایک قدیم رسالہ موجود ہے جو ایک صاحب فن کی تصنیف ہے۔ ضرورت ہے کہ کتب تفاسیر کو چھوڑ کر علوم القرآن کی مختلف موضوعات کی کتابوں کی طرف توجہ کی جائے اور ان کو تلف ہونے سے بچایا جائے۔

اب آج کل محنت کے بچانے کے لئے بڑی بڑی کتابوں کے انڈکس کی ضرورت عیاں ہے۔ احادیث میں کتب الاطراف کو احادیث کا انڈکس ہی کہنا چاہیئے۔ مگر اس قسم کی ایک کتاب بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ اس لئے ایک ایک حدیث کی تلاش میں ہر طالب تحقیق کو گھنٹوں بلکہ کئی کئی دن برباد کرنے پڑتے ہیں۔ مجمع الفوائد یا جامع سیوطی یا کنز العمال سے یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ جناب مولانا عبد العزیز صاحب خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ نے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے اور صحیح بخاری کی اطراف لکھکر کتنے علماء کی زندگیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ یورپ میں اس سلسلہ میں جو کام

ہو رہا ہے اور مصر کے چند نوجوانوں نے ذرا سے تغیر اور اصلاح سے اس میں جو ترقی کی ہے وہ تکمیل ایک حد تک اس ضرورت کو پورا کردے گی مگر پھر بھی احادیث کی ایک ایسی فہرست جو ہر حدیث کا ہر کتاب میں اور کتاب کے ہر باب میں پتا دے مطلوب ہے۔

ہماری کتب تفسیر میں ابن جریر طبری کا جو پایہ ہے وہ ظاہر ہے، مگر وہ جس قدر طویل اور وسیع ہے اور جس طرح مباحث گوناگوں پر مشتمل ہے وہ سب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر زبیر صاحب صدیقی (کلکتہ) کی تجویز ہے کہ چند اہل علم مل کر اس کتاب کی تیسوں جلدوں کا ایسا انڈکس تیار کردیں جس سے اس تفسیر کے علوم و مباحث سے ہر شخص باسانی فائدہ اٹھا سکے۔ اسی طرح ہماری کتب احادیث میں مسند ابن حنبل کی حیثیت احادیث کی انسائکلوپیڈیا کی ہے۔ اس کی ترتیب و تبویب اور مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے اس کے لئے مختلف فہرستوں کی ضرورت ہے، لاہور کے ایک فاضل عالم نے اس کے رجال مسانید کی فہرست شائع فرمائی ہے جس سے بڑا فائدہ ہوا ہے اور بہتوں کا وقت تلاش و محنت سے بچا ہے۔

اسی طرح کرنے کے بہت سے کام ہیں جن کو آپ میں سے بہت سے اصحاب مجھ سے بہتر جانتے ہیں، میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف تذکیر کے لئے کہا ہے، اب تک ان علوم کے واقف کار صرف ہمارے پرانے علمائے کرام ہیں جنھوں نے ہر طرح کی بے سروسامانی اور زمانہ کی ناقدری کے باوجود ان جواہرات کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا ہے اور سلف کے ترکہ کو حفاظت کے ساتھ خلف تک پہنچایا ہے لیکن وہ زمانۂ حال کے طور طریق اور ضرورتوں سے واقف نہیں۔ ضرورت ہے کہ نئے اور پرانے طریق کے اہل علم اور علماء آپس میں تعاون کریں اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے تیار ہوں تو اسلامی علوم و فنون کی ترقی و اشاعت کا نیا دور پیدا ہو۔ میں آج کے اس جلسہ کو جس میں اسلامی علوم فنون کے نئے اور پرانے خدمت گزار موجود ہیں اس دور کے آغاز کی تمہید اور تقریب سمجھتا ہوں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

خطبۂ صدارت

شعبۂ مدارس اسلامیہ

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا، وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور ہر شعبہ کا ایک علیحدہ صدر اور مستقل سکرٹری تھا۔

منجملہ ان شعبوں کے ایک شعبہ مدارس اسلامیہ تھا، جس کے صدر مولانا حاجی سید حسین احمد صاحب مدنی اور سکرٹری مولانا حاجی ابوبکر محمد شیث صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی تھے۔

اس شعبہ کا پہلا اجلاس ۲۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۸ بجے صبح "اسٹریچی ہال" میں منعقد ہوا، اور دوسرا ۲۹ مارچ کو مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں ہوا۔

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے بحیثیت صدر شعبۂ مدارس اسلامیہ اسٹریچی ہال میں جو خطبہ پڑھا وہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ صدارت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی الہ وصحبہ وبارک وسلم

امابعد معزز حاضرین! اکابرین امت۔ محترم بھائیو! سب سے پہلے میں آپ حضرات کی ذرہ نوازی اور مربیانہ الطاف وعنایات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھ جیسے ایک معمولی طالب علم کو شعبۂ مدارس اسلامیہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ واقعیت کی حیثیت سے یہ امر اگرچہ غیر مناسب اور ناموزوں تھا مگر آپ کے اخلاق کریمانہ اور عنایات مربیانہ کا تقاضا ضرور تھا کہ قوم کے ادنیٰ ترین غلاموں کی ہمت افزائی کیجائے۔ میں اپنی بے بضاعتی اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے سمجھتا تھا کہ ہرگز ہرگز میں ایسے اہم منصب کا مستحق نہیں ہوں اس لئے اپنے اعذار کو پیش کرکے اپنے محترم اور معظم بزرگ مولانا ابوبکر صاحب ناظم دینیات و سکرٹری شعبۂ مدارس اسلامیہ سے بار بار ملتجی ہوا کہ وہ مجھ کو ایسے اہم منصب سے سبکدوش فرمائیں اور میری عدیم الفرصتی اور نالائقی کو ملاحظہ فرماتے ہوئے نظر عفو وکرم کو کام میں لائیں مگر بے مجھے افسوس ہے کہ مولانائے موصوف نے میری التجاؤں پر التفات نہ فرمایا اور کشاں کشاں مجھ کو آپ حضرات کی بارگاہ علیا میں پہونچا دیا۔ بہر حال میں تہ دل سے مولانا دامت برکاتہم اور آپ بزرگوں کا شکر گذار ہوں۔ اور اپنی بے علمی اور ناقابلیت کے اقرار کے ساتھ چند معروضات پیش کرنے کا فخر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ فَاِنْ کَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللہِ وَتَوْفِیْقِہٖ

وان کان باطلاً فمنی ومن الشیطان!

آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ

میرے محترم بزرگو! آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) جس طرح آخرت کے فلاح و نجاح کے ذرائع اور اسباب کو بتلاتی ہیں اسی طرح اس دنیاوی زندگی کے فلاح وبہبودی پر بھی پوری روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ جس طرح روحانیت اور ملکیت کی دشوار گذار گھاٹیوں میں رہنمائی کرتی ہیں اُسی طرح مادیت اور بہیمیت کی اصلاح اور درستی کی راہوں میں بھی مشعل ہدایت بنتی ہیں۔ وہ جس طرح مخلوق کو خالق اور اس کی رضا وخوشنودی سے دوچار کرتی ہیں اسی طرح مخلوقات کے آپس کے تعلقات کو بھی نہایت استوار اور مہذب بناتی ہیں۔ وہ جس طرح شخصی اور انفرادی اخلاق واعمال کی درستی کی ذمہ داری کرتی ہیں اسی طرح اجتماعی زندگی اور سیاسی ترقیات کی بھی کفالت کرتی ہیں۔ وہ اگر ایک طرف تدبیر منزل اور سیاسات مدنیہ کی اصلاحی اسکیم پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف اعتقادات حقہ اور حکم بالغہ کی طرف بھی ہدایت کرتی ہیں۔ انہوں نے اگر اوہام وشکوک اور عقاید باطلہ کا قلع اور قمع کر دیا ہے تو دوسری طرف بیکاری گداگری، آرام طلبی، اسراف، ظلم وستم، کمزوروں اور ضعفاء کو ستانے وغیرہ کو بھی جڑسے کھود ڈالا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عالم انسانی کی روحانی اور جسمانی زندگی اور ترقی کی جس قدر ضرورتیں اور حوائج تھیں خواہ اس عالم سے تعلق رکھتی ہوں یا آئندہ پیش آنے والے عالم سے وابستہ ہوں سب ہی کے لئے ان میں مکمل ہدایات اور رہنمائی موجود ہے۔ قرآن کو اٹھا کر دیکھئے اگر ایک جگہ اقیموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ کا حکم ہے تو دوسری جگہ واعدوا لھم ما استطعتم الآیہ کا ارشاد ہے اگر کہیں یاایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً فرمایا گیا ہے تو دوسری جگہ اصلحوا بین اخویکم اور ولا تنابزوا بالالقاب وغیرہ آداب معاشرت کو ذکر کیا گیا ہے۔ اگر کہیں حج روزہ اور زکوٰۃ کے احکام ذکر کئے گئے ہیں تو دوسری جگہ جہانبانی اور حدود وقصاص تعزیر و نکاح، طلاق وخلع، جنگ وصلح کے قوانین بتلائے

گئے ہیں اگر کہیں اعمال و اموال کی اصلاحی تدبیریں زہد و ریاضت کی عمدہ صورتیں بتائی گئی ہیں تو دوسری جگہ عقاید حقہ اور علوم صادقہ کی تعلیمات موجود ہیں اگر کہیں اُمم ماضیہ اور اقوام عالم کی تاریخ پیش کر کے عبرت دلائی گئی ہے تو دوسری جگہ زمینوں اور اقالیم کی جغرافی حالتوں اور ان کی آیات وغیرہ کو نظر فکر و غور سے دیکھنے کا ارشاد کیا گیا ہے۔ اگر ایک جگہ فلکیات اور نجوم و کواکب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تو دوسری جگہ کائنات الجو اور نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اگر ایک جگہ فلسفہ جمادات، نباتات، حیوانات، عنصریات طبیعیات و مابعد الطبیعات کو سمجھایا گیا ہے تو دوسری جگہ حکمت ابدان و نفوس، روحانیات عالم ملکوت، مافوق الحسیات وغیرہ کو روشن کیا گیا ہے۔

الحاصل مذہب اسلام اور اس کے علوم و تعلیمات ایک جامع اور مکمل روشنی ہے جس میں ہر قسم کی اصلاح اور ہر نوع کی ہدایتیں موجود ہیں۔ وہ ان مذاہب کی طرح سے ناقص مذہب نہیں ہے جس میں انسانی نجات کے ایک پہلو کا تکفل کیا گیا ہو اور دوسرے پہلوؤں سے اعراض اور بے توجہی برتی گئی ہو۔

آں حضرت صلعم کی حیات و تعلیمات

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ تیئیس سالہ زندگی اور تعلیمات کو ملاحظہ فرمائیے کہ کس قدر جامع واقع ہوئی ہے۔ اگر ایک طرف آپ اصول خلافت و سلطنت، جمہوریت اور آداب حکمرانی، تدابیر مملکت حل و عقد، صلح و جنگ وغیرہ عمل میں لاتے اور تعلیم فرماتے ہیں۔ تو دوسری طرف سیاست منزلی، تہذیب اخلاق، آراستگی آداب، خاندانی معاملات، گھرانوں کے آپس کے تعلقات کو اعلیٰ پیمانہ پر عمل میں لاتے ہوئے لوگوں کو سکھلاتے ہیں۔ اگر کبھی آنجناب علیہ الصلوٰۃ والسلام مسند قضا اور کرسی انصاف و فصل خصومات، قطع منازعات پر جلوہ افروز ہوتے ہوئے جج اور چیف جسٹس کے فرایض کو انجام دیتے اور امت کو اُن کا درس دیتے ہوئے اُن کے دستور العمل کی تعلیم کرتے ہیں تو کبھی قواعد تقنین، استخراج مسائل، انتشار واقعات، استنباط احکام عمل میں لاتے ہوئے لوگوں کو لا اور قانون کا ماہر بناتے ہیں۔ اگر کبھی آپ کرسی احتساب پر بیٹھے ہوئے حدود و قصاص، تعزیر و حبس، ضرب حدود

تادیب وغیرہ مجرموں، قانون کو ہاتھ میں لینے والوں، اہل فسق وفجور، اصحاب بغی وعدوان ارباب منکرات قانون شکنی کرنیوالوں وغیرہ پر جاری فرماتے ہوئے طرق سیاست اہل بدعات، قواعد احتساب، ذرائع سد منکرات، قوانین روک وتھام مداخل شہوات وغضب، تعدی وعصب تعلیم فرماتے ہیں تو کبھی خوش الحانی اور عمدہ طریقہ پر قرآن خوانی کرتے ہوئے قلوب اور ارواح کو زندہ کرتے اور قواعد قرارت وتجوید، مخارج حروف اور صفات اظہار واخفاء وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر کبھی اوراد وادعیہ، نوافل نماز و روزہ، شب بیداری اور تہجد گذاری ذکر و فکر، اعمال روحانی وغیرہ میں مستغرق ہوتے ہوئے انوار ربانیہ کو جلوہ افروز اور ملائکہ روحانیہ کو جذب کرتے اور مادّی ظلمات اور نفسانی کثافتوں کو دور کرتے ہوئے حاضرین بارگاہ کی غفلتوں اور پراگندگی کو دفع کرتے ہیں ان کو طرق ذکر و فکر وغیرہ کی تعلیم اور ان کا تصفیہ اور تزکیہ کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں تو کبھی اسرار ذات وصفات وافعال واحکام الٰہیہ اور بے غایت وبے نہایت علوم وحقایق کو بیان فرماتے ہوئے لوگوں کو علوم حقایق اور حکم حقیقیہ کی تعلیم کرتے ہیں۔ اگر کبھی آپ ممبر وعظ ونصیحت پر جلوہ فرماتے ہوئے دلوں اور روحوں میں زلزلہ ڈالتے ہیں اور ترغیب اور ترہیب کے میدان میں اوتر کر دوزخ کے عذاب، قبر اور حشر ونشر کے ہولناک مناظر حساب اور میزان وپل صراط کے جاں گداز مصائب اور مشکلات، جنت کی اعلیٰ درجہ کی نعمتیں اور اس کے مقامات عالیہ اور ان کے ذرایع اور اسباب کو ذکر کرکے کافروں کی زنّاروں کو توڑواتے، نافرمانوں اور عاصیوں سے توبہ کراتے، سخت دلوں کو موم بناتے اور مادّی دنیا اور اس کے تعلقات سے زاہد اور متنفر کرتے ہوئے حق شناسی کی تعلیم وتلقین کے میدان میں اوترے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی میادین جنگ احد، بدر، حنین، تبوک وغیرہ میں اوتر کر مورچہ بندی، صف آرائی، ترتیب افواج، قتل وقتال، فتح وشکست وغیرہ خدمات سپہ سالاری وجرنیلی انجام دیتے ہوئے لوگوں کو مکمل فوجی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر کبھی آپ ماہر اقتصادیات اور استاد معاشیات بن کر تجارات، صناعات، کسب معیشت، زراعات وغیرہ کی تعلیمات اور ترغیبات دیتے ہوئے

اقتصادیات کی تلقین بیکاری اور گداگری کی قباحتیں ذکر فرماتے اور بیع وشرار، مزارعت اور مساقاۃ، سلم واجارہ، رہن اور حوالہ، کفالت اور شرکت وقف اور ودیعت وغیرہ ضروری معاملات کے قوانین بتاتے اور تعلیم دیتے ہیں تو کبھی[۱۲] فرائض رسالت وسفارت انجام دیتے ہوئے تبلیغ اور دعوت فرماتے اور دنیا کی قوموں اور بادشاہتوں کو حق پرستی اور حقیقی اصلاح اور نجات کی طرف بلاتے ہیں، لوگوں کو حسب استعداد وقابلیت اطراف عالم کی طرف بھیجتے ہیں، اقوام عالم کے قلوب کو مائل کرنے ان کی ارواح کو مسخر کرنے کی عمدہ سے عمدہ تدبیریں عمل میں لاتے ہیں۔ اگر کبھی[۱۳] مرشد کامل بنکر ارشاد وتلقین تزکیہ اور تجلیہ عمل میں لاتے ہوئے اپنی روحانی طاقت اور توجہ قلبی سے لوگوں کے دلوں اور روحوں سے نفسانی کدورتوں اور مادی آلائشوں کو دور کرتے اور اس کی تعلیم دیتے ہیں تو کبھی[۱۴] جسمانی امراض اور ابدانی اسقام کے معالجہ کرنے والے خواص عقاقیر وادویہ اور امراض کی تشخیص کرنے والے اور اس کی تعلیم دینے والے نظر آتے ہیں۔ الغرض جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ زندگی اور آپ کی تعلیمات پر اگر غور سے نظر ڈالی جائے اور آپ کی تعلیمات پر توجہ کیجائے تو اس قدر جامع اور کامل نظر آئے گی کہ جس کی نظیر کسی رہبر اور کسی ہادی میں ملنی دشوار بلکہ محال ہے۔

آپ کی صداقت اور کمالات کے متعلق جو کچھ غیر مسلموں نے لکھا ہے اور جو کچھ آپ کی سچی اور بے لوث مکمل تعلیمات پر مخالفین نے رائے زنی کی ہے اگر ہم جمع کریں تو ایک طویل دفتر ہو جائے۔ مگر بطور مشتے نمونہ خروارے ہم مسٹر طامس کارلائل کا وہ مقولہ نقل کرتے ہیں جو اس نے اپنی تصنیف ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ میں لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے:

صاف شفاف قلب اور پاکیزہ روح رکھنے والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیوی ہوا وہوس سے بالکل بے لوث تھے ان کے خیالات نہایت متبرک اور ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ تھے وہ ایک سرگرم اور پرجوش ریفارمر تھے جن کو خدا نے گمراہوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا تھا ایسے شخص کا کلام خود خدا کی آواز ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انتھک کوشش کے ساتھ حقانیت کی اشاعت کی اور زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے مقدس مشن کی تبلیغ جاری رکھی۔

دنیا کے ہر حصہ میں ان کے متبعین بکثرت موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کامیاب ہوئی۔ (عصر جدید - ۱۸ اگست ۱۹۲۹ء) اور یہی وجہ ہو کہ آپ کے صحابۂ کرام اور تلامیذ عظام نے کامل ہادی اور مکمل ریفارمر بن کر آپ کے بعد ہی تقریباً تمام دنیا میں عدل اور حقانیت، خدا ترسی اور عدالت، اخلاص اور للٰہیت، سچی مساوات اور مکمل سیاست، کامل ہمدردی اور اخوت انصاف اور جمہوریت پھیلا دی۔ بچوں کا قتل کرنا مٹا دیا۔ ناروا غلامی کو دور کر دیا۔ ملکی حقوق میں برابری دیدی۔ اپنوں اور غیروں، مسلم اور غیر مسلم، ایشیائی اور افریقی، عرب اور عجم وغیرہ میں یکساں انصاف کیا۔ بھاری بھاری محصولات سلطنت کو گھٹا کر دسواں اور بیسواں اور چالیسواں حصہ کر دیا۔ تجارت کو تمام بیجا محصولات اور مزاحمتوں سے آزاد کر دیا۔ اسلام کے معتقدین کو مذہبی سرگروہوں کے لئے جبریہ ٹیکس دینے سے بری کر دیا۔ مغلوب مذاہب پر غالب کے لئے مذہبی چندوں کی رسم کو مٹا دیا۔ انہوں نے ان مفتوح اقوام کو بھی ہر قسم کے حقوق اپنوں کی طرح عطا کئے جو کہ اپنے ہی مذاہب کے پابند تھے۔ ان کے جان و مال عزت و آبرو کی اسی طرح حفاظت کی جس طرح مسلم اقوام کی کی جاتی تھی ان کو ہر قسم کی پناہ دی۔ انہوں نے مال کی حفاظت کے لئے سود دینے لینے کو اور بغیر حکم عدالت خون کا بدلا لینے کو موقوف کر دیا۔ صفائی اور پرہیزگاری کا تحفظ کیا۔ حرام کاری کو موقوف کر دیا۔ غریبوں کو خیرات دینے اور بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں پر رحمت و شفقت کی ہدایت کی حیا اور شرم کو پھیلایا فواحش اور منکرات کو مٹایا۔ اوہام باطلہ اور من گھڑت اور مادی آلہہ کی حکومت کو اقوام عالم سے نیست و نابود کر دیا اور ان کی نفرت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی۔ ان تھوڑے ہی دنوں کی تعلیم و تربیت سے اگر ایک طرف خالد بن ولید، ابو عبیدۃ بن الجراح، سعد بن وقاص، عمرو بن عاص، سلمان فارسی وغیرہم جیسے فاتحین عالم اور سپہ سالار پیدا ہو گئے جنہوں نے قوی سے قوی اور مضبوط سے مضبوط سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تو دوسری طرف ابوبکر بن ابی قحافہ، عمر بن خطاب، عثمان بن عفان، معاویہ بن ابی سفیان جیسے سیاسی جہانبان بنا دیئے گئے۔ اگر ایک طرف ابوذر غفاری، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عمرو بن العاص

جیسے زہاد و عباد تارک الدنیا بن گئے تو دوسری طرف حکیم بن حزام، عبدالرحمٰن بن عوف جیسے اعلیٰ درجہ کے تاجر تیار ہو گئے۔ اگر ایک طرف حضرت علی بن ابی طالب، زید بن ثابت، عبداللہ بن عباس جیسے قاضی اور جج تیار ہو گئے تو دوسری طرف ابوہریرہ، انس بن مالک، عبداللہ بن مسعود جیسے پروفیسران علوم موجود ہو گئے۔ (اگر طول کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کی تفصیلی فہرست پیش کرتا) یہی تعلیمی جامعیت اور مذہب کی ہر قسم اور ہر شعبہ پر شان احتوا رکھتی جس کے ہر ہر قانون اور ہر ہر قاعدہ میں مشفقانہ اصلاح اور مربیانہ ہمدردی بھری ہوئی تھی اس لئے مسلمانوں کو باوجود ہر قسم کی بے سرو سامانی کے اقوام عالم پر حکمراں بنا دیا بڑی سے بڑی قوتیں ان کے سامنے سربسجود ہو گئیں یہ مذہب اسلام عالم انسانی کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا۔ قومیں فوجاً فوجاً اسلام کی حلقہ بگوش ہو گئیں نہ صرف مفتوح قومیں بلکہ اجنبی ممالک اور فاتح اسلام قومیں بھی اسلام میں داخل ہو گئیں جس کی بنا پر نہایت ہی تھوڑے عرصہ میں بحر اٹلانٹک کے مشرقی ساحل سے لیکر بحر پاسفک کے مغربی ساحلوں اور اس کے جزائر تک اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا اور باوجودیکہ بانی اسلام کی جدائی کے وقت مسلمانوں کی مردم شماری چار لاکھ سے زاید نظر نہیں آتی مگر آج بقول نیویارک ٹائمز اسلام کے ماننے والے ستر کروڑ پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے اسی تعلیم قرآن و حدیث کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے علٰحدہ علٰحدہ فنون بنائے۔ علم عقاید و توحید میں بہت سی کتابیں مختصر اور مطول لکھی گئیں جن میں اونہیں علوم صادقہ اور حقایق یقینیہ پر روشنی ڈالی گئی جو کہ الٰہیات اور رسالت، مبدا اور معاد وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شکوک اور شبہات باطلہ اور اوہام و خیالات فاسدہ کو جن میں دوسرے مذاہب مبتلا تھے ان کا قلع اور قمع کیا گیا فلسفۂ یونان وغیرہ کے ترجمہ ہونے کے بعد جو امور باعث شکوک ہوئے تھے یا ہو سکتے تھے ان کے ازالہ کے لئے طویل طویل بحثیں پیش آئیں اور علم کلام مدون ہوا۔ ان میں دہریہ، ملاحدہ، یہود، نصاریٰ، بت پرستوں وغیرہ کے شبہات وغیرہ پر پوری روشنی ڈالی گئی علم فقہ میں تمام اسلامی قوانین کو ضبط کیا گیا جو کہ محض طہارت و عبادت نماز روزہ زکوٰۃ و حج کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے بلکہ ان میں تدبیر منزل کے تمام قوانین خواہ نکاح و طلاق،

عدت رجعت خلع او رایلا روغیرہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں یا معاشرت اور امور خانہ داری انصاف بین الازواج والاقربار والخدمہ سے وابستہ ہوں سب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز غیر مسلم رعایا اور اعدار اسلام اور مخالفین خلافت اسلامیہ، نافرمانان قوانین وغیرہ کے متعلق احکام وتعزیرات، صلح وجنگ، جزیہ اور ٹیکس وغیرہ کے اصول وقوانین بتائے گئے ہیں دنیاوی زندگی کے تمام معاملات، کمپنیوں اور شرکتوں کے قواعد، تجارات اور صناعات کے احکام، فصل خصو مات شہادات اور ایمان کے تمسکوں اور اقرار ناموں، فارموں اور اسٹامپ، وصیت ناموں وکالت ناموں وغیرہ کے ضوابط اور صور درج کئے گئے ہیں فتاویٰ اور شروح جن پر تمام اسلامی حکومتوں کا ہمیشہ عملدرآمد رہا ہے انہیں قوانین سے پُر ہیں۔

علم تصوف میں اخلاقیات پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ زہد ریاضت التقویٰ اور پرہیز گاری، خداترسی اور خلقت پروری، روحانیت اور محاسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، تفسیر، قرارت وتجوید، تصوف اور ان کے آلات وذرایع نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع، ادب، لغت، فرائض، طب حساب، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، ہیئت، فلسفہ، منطق، جبر ومقابلہ مساحت، مناظرہ، اصطرلاب ربع مجیب وغیرہ ہر قسم کے فنون ہیں جن کو مدارس اسلامیہ کے پروگرام میں ہمیشہ سے کم وبیش حصہ دیا گیا ہے۔

ان علوم وفنوں میں سب سے زیادہ خداترسی اور تعلق الٰہی اور رضاجوئی خداوندی کو اہمیت دی گئی ہے۔ مخلوق کو خالق سے وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اخلاق فاضلہ خیر اندیشی، فیض رسانی، پاک دامنی، حیا، تحمل، صبر، کفایت شعاری سچائی، راست بازی، صلح پسندی، سچی محبت وہمدردی، توکل بخدا، رضا بالقضار، انقیاد امر الٰہی، عالی ہمتی، رعایا پروری، رواداری، ایثار وقربانی وغیرہ کو بہت زیادہ سراہا گیا ہے۔ ناانصافی، کذب، غرور، انتقام، غیبت، استہزار، طمع، فضول گوئی، فضول خرچی، خودغرضی، عیاشی، خیانت، بدعہدی، بدگمانی، قطع رحمی، نفاق

وغیرہ بُرے اخلاق واعمال کو نہایت زیادہ قابل ملامت ونفریں قرار دیا گیا ہے اور ان کو نہایت زیادہ قبیح بلکہ بے دینی بتایا گیا ہے۔ ان میں سچائی کے ساتھ مخلوق خدا کے ساتھ احسان وکرم، نفع رسانی اور خیر خواہی کی تاکید کی گئی ہے۔ ابتدا ہی سے تعلیمات اسلامیہ میں ایسی ایسی درسیات داخل کی گئی ہیں جن سے بچپن ہی سے اس قسم کے جذبات پیدا ہو جائیں بے حیائی اور خود غرضی، فواحش اور دست درازی گناہوں وغیرہ سے نفرت دل میں جاگزین ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تعلیمات میں کریما، مامقیما، پندنامہ عطار، گلستان، بوستان وغیرہ جیسی کتب داخل کی گئیں جن سے روحانیات اور روحانی اخلاق میں روز افزوں ترقی موجزن ہوتی تھی۔ ان میں خداوند کریم کی غیر محدود طاقت اور علم کا یقین دلایا گیا ہے بُرائیوں اور ممنوعات کے ارتکاب پر بے پناہ عذاب خداوندی سے ڈرایا گیا ہے اور فرمانبرداری اور عمدہ اعمال واخلاق پر غیر متناہی انعامات کے پختہ وعدے کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے حقیقی امن وامان اور کامل ترقی اور فلاح دنیا اور آخرت میں ہو سکتی ہے۔ تنہائی میں، مجالس میں، چہار دیواری کے احاطوں میں، پہاڑوں میں، جنگلوں میں، تہ خانوں میں شہنشاہی تخت پر، مضبوط قلعوں کے احاطہ میں، افواج وعساکر کے قوتوں کے ساتھ، بیچارگی اور کمزوری کی حالت میں، یکساں طور پر بُرے اعمال واخلاق سے بچنا اور محاسن افعال وملکات کو اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

مگر مغربی علوم اور تعلیمات جدیدہ ان معالی سے عموماً خالی ہیں۔ وہ[۱] خدا کے وجود اس کی غیر متناہی طاقتوں، عالم آخرت کی جزا اور سزا اس کے صفات کاملہ وغیرہ سے نہ صرف بے پرواہ ہیں بلکہ بسا اوقات ایسی تعلیم پر استہزا کرنے والی اور الحاد و دہریت کی طرف کھینچ کر لے جانے والی ہیں۔ وہ[۲] روحانیت اور ملکیت کی دشمن اور مادہ پرستی کی شیدا ہے۔ وہ اسباب مزعومہ اور علل مخترعہ کی اس قدر فریفتہ ہے کہ اس کے نیازمندوں کو کبھی روح اور مافوق الطبیعہ کا وہم وخیال بھی نہیں آتا روحانی ترقیات اور ملکی صفات واحوال سے اس کو انتہائی گریز ہوتا ہے۔ وہ[۳] خود غرضی کے میدان میں اس قدر سرگرم ہے کہ جس کے لئے اقوام اور امم کو، ممالک اور اقالیم کو موت کے

گھاٹ اوتار دینا اور بے زر و بے درم بنا دینا نہ صرف جائز بلکہ کمال شمار کرتی ہے۔ چنانچہ یہی معاملہ تمام یوروپین اقوام کا اپنے مستعمرات کے ساتھ جاری ہے۔

سر جان شور ۱۸۳۳ء میں کہتا ہے:

برطانوی صنعت بڑھانے کے لئے ہندوستانی دستکاری کا گلا گھونٹنا بڑے فخر کے ساتھ انگریزی تدبیر قرار دیا جاتا ہے حالانکہ یہ برطانوی قساوت کا ایک بہت ہی بڑا ثبوت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے ملک کی ترقی کے لئے انگریزوں نے کس طرح جنگی اور محصول لگا کر ہندوستانی صنعتی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

دوسری جگہ لکھتا ہے۔ "لیکن ہندوستان کا عہد زرین گذر چکا ہے۔ جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اس کا جزو اعظم ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے اور اس کے قدرتی عمل اس بدعملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدے کی خاطر قربان کر دیا ہے،، (حکومت خود اختیاری) وہ نفاق اور ڈپلومیسی کو مایۂ فضیلت اور ذریعۂ فخر و مباہات سمجھتی ہے

مسٹر جارج ایلن اینڈ انون۔ لندن کا مشہور پبلشر کتاب "جنسی تمدن" سے اقتباس ذیل شائع کرتا ہے:۔

"موجودہ تمدن کا سارا لب لباب منافقت ہے۔ لوگ اپنا عقیدہ ظاہر خدا پر کرتے ہیں لیکن عملاً اپنی جانیں تک مال پر قربان کرتے رہتے ہیں زبانوں پر آزادی کا دعویٰ رہتا ہے لیکن جو آزادی کے علم بردار ہوتے ہیں انہیں کو سزائیں ملتی ہیں۔ دعوے مسیح کی پیروی کا ہے اور اطاعت مسولینی کی کیجا رہی ہے۔ عزت کے الفاظ عصمت کے متعلق استعمال کئے جاتے ہیں لیکن عملی زندگیاں حرام کاری اور آتشک کے لئے وقف ہیں۔ زبانی داد دیانتداری کی دیتے ہیں لیکن عملاً اقتدار و اختیار کی کرسیوں پر بد دیانتوں ہی کو بٹھائے ہوئے ہیں۔ زبانوں پر اخوت کے نعرے ہیں لیکن جو بھائی ان کی جنگ یا وطنیت یا قومیت کے بدمستانہ جلوسوں میں شریک نہیں ہوتے ان کے لئے یا جیل خانہ ہے یا جلاوطنی یا بندوق کی گولیاں،، (سچ لکھنؤ ۲۴ جنوری ۱۹۳۰ء)

وہ حدود و قوانین کی مراعات کرتے ہوئے ہر قسم کی بے حیائی، فواحش، اسراف و فضول خرچی کی نہ صرف اجازت دیتی ہے بلکہ بسا اوقات ضروری قرار دیتی ہے۔ انگلستان اور دیگر ممالک یورپ اور امریکہ کے حرامی بچّوں کی تعداد ہائیڈ پارک اور دوسرے مقامات کی حرام کاری کی رپورٹیں اور بے حد و شمار مادر زاد برہنگی کی روز افزوں ترقی وغیرہ طلاق اور خلع کا موجیں مارنے والا سیلاب دیکھئے اور غور کیجئے۔ وہ اپنے وطن اور قوم کے لئے ہر قسم کے مظالم ہر قسم کی دست درازیوں کو روا اور جائز رکھتی ہے۔

سر جان شور ۱۸۳۳ء میں کہتا ہے:

"برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت میں ملک اور باشندگاں ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلد تباہی آگئی۔ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔"

جان سلیون کہتا ہے:

"ہمارا طرز حکومت اسپنج کے مانند گنگا کے دہارے سے ہندوستان کی دولت چوستا ہے اور دریائے ٹامز کے کنارے جا کر نچوڑ دیتا ہے۔" (حکومت خود اختیاری)

وہ مذہب اور دین کو جنون اور لغو قرار دیتے ہوئے لا مذہبی اور بے دینی کو مایۂ افتخار و مباہات سمجھتی ہے۔ وہ اس دنیاوی زندگی اور مادی ترقی ہی کو مقصد حیات اور بام ترقی قرار دیتی ہے اس کے بعد اُس کے نزدیک کوئی مقصد اور مطمح نظر نہیں ہے۔ وہ انبیاء اور رسل کی تعلیمات زاکیہ کو بے معنی اور دشمن انسانیت سمجھتی ہے۔ وہ رشتہ داروں میں میل ملاپ، بڑوں اور بزرگوں سے تادّب، چھوٹوں اور اپنوں پر رحمت و شفقت، فقیروں اور مسکینوں کی خبر گیری اور ان پر خیرات و صدقات کی دشمن ہے۔ وہ سادہ زندگانی اور کم خرچ معیشت کی راہ میں انتہائی رکاوٹ پیدا کرنے والی اور سرمایہ دار مادّہ پرست مغربی قوموں کے فیشن کا پرستار بنانے والی ہے۔ خیال فرمائیے کہ وہ امریکہ جس کے ہر ہر فرد کی روزانہ آمدنی کا اوسط ۱۲ شلنگ ہے

اور وہ انگلستان جس کے ہر ہر فرد کی آمدنی کا اوسط روزانہ ۱۲؎ ہے (دیکھو انقلاب مورخہ ۲۹ رجولائی ۱۹۲۶ء) اس کے فیشن اور تہذیب و مصارف کا اتباع اگر برطانی عہد کا وہ ہندوستان کرنے لگے جس کے ہر ہر فرد کی روزانہ آمدنی کا اوسط ایک پنس ہے بقول سر ولیم ڈگبی اور ۲/ا بقول انقلاب ۲۹ رجولائی ۲۶ء اور تقریباً ۱/۲ بقول لارڈ کرزن پڑتا ہے تو بجز ہلاکت اور بربادی کیا حاصل ہو گا۔ یہی اور ان کے مثل دیگر وجوہ ہیں جنہوں نے عالم مشرق اور بالخصوص اسلامی دنیا اور بالاخص مسلمانان ہند کے علوم و معارف اور ان کی درس گاہوں اور ان کی زندگانی کو تباہی کے گھاٹ اتار دیا۔ مغرب کے سربرآوردوں نے ہمیشہ سے مشرق کی تعلیم گاہوں اور علوم کو مٹانے میں انتہائی سرگرمی کا ثبوت دیا۔ وہ قرآن شریف جو کہ تمام علوم و معارف کا سرچشمہ ہے اور تمام کمالات دینی و دنیوی روحانی اور مادّی کا مرکز اور منبع ہے۔ جس وقت سے وہ اتارا گیا ہے آج تک محفوظ و مصؤن رہکر ہر قسم کی تحریفات وغیرہ سے محفوظ چلا آتا ہے۔ جس کے ہر قسم کے کمالات کے نہ صرف مسلمان بلکہ مخالفین بھی پُرزور الفاظ میں اقرار کرتے رہے ہیں۔

سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھتا ہے:

"جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن مجید) کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔"

ڈاکٹر موریس فرانسیسی مشہور مصنف لکھتا ہے:

"قرآن اپنی تعلیم کی خوبیوں کے لحاظ سے تمام دنیا کی مذہبی کتابوں سے افضل ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلی عنایت نے جو کتابیں دیں ان سب میں قرآن بہترین کتاب ہے۔"

ڈاکٹر ماریس کہتا ہے:

"قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا جس سے بہتر ممکن نہ تھا" (تنقید الکلام مصنفہ سید امیر علی)

ڈاکٹر اسٹین گاس اپنی ڈکشنری میں کہتا ہے:

"قرآن کی خاص خوبی اس کی ہمہ گیر صداقت میں مضمر ہے"

جارج سیل (مشہور مترجم قرآن) کہتا ہے:۔
"قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا یہ وہ مستقل معجزہ ہے جو مردوں کو زندہ کرنے کے معجزہ سے بلند تر ہے۔"

پادری والرین بی ڈی (پیٹسبرگ کے گرجے میں امن عالم کی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے) کہتا ہے۔
"مسلمانوں کا مذہب جو قرآن کا مذہب ہے ایک امن اور سلامتی کا مذہب ہے"

گاڈ فری ہگنس کہتا ہے:
"قرآن کمزوروں اور غریبوں کا غمخوار ہے اور نا انصافی کی جابجا مذمت کرتا ہے"

ڈاکٹر کینن آئزک ٹیلر (کلیسائی انگلستان کے صدر نشین کی حیثیت سے ۱۸۸۷ء میں تقریر کرتے ہوئے) کہتا ہے:
"اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے جو تہذیب و تمدن کا علم بردار ہے۔"

نیر ایسٹ (لندن کا مشہور اخبار) لکھتا ہے:۔
"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و ارشاد (قرآن) کی قدر و قیمت اور عظمت و فضیلت کو اگر ہم تسلیم نہ کریں تو ہم فی الحقیقت عقل و دانش سے بیگانہ ہیں"۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن میں لکھتا ہے۔ (معجزہ قرآن مجید ص ۱۶۳)
"منجملہ بہت سی اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کے جو قرآن کے لئے واجب طور پر باعث فخر و ناز ہو سکتی ہیں دو خوبیاں نہایت بیّن ہیں یعنی اوّل تو اس کا وہ موؤبانہ اور ہیبت و رعب سے بھرا ہوا طرز بیان جو ہر اس مقام پر جہاں خدا تعالیٰ کا ذکر یا اس کی ذات کی طرف اشارہ ہے اختیار کیا گیا ہے اور جس میں خداوند عالم کی ذات سے ان جذبات اور اخلاقی نقائص کو منسوب نہیں کیا گیا جو انسان میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اس کا ان تمام خیالات و الفاظ اور قصوں سے مبرا ہونا جو فحش اور خلاف اخلاق اور غیر مہذب ہوں۔ حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے

کہ یہ عیب توریت وغیرہ کتب مقدسہ یہود میں بکثرت پائے جاتے ہیں فی الحقیقت قرآن ان سخت عیوب سے ایسا مبرا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں۔ اوّل سے آخر تک اسے پڑھ جائے تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پاؤ گے جو پڑھنے والے کے چہرہ پر شرم و حیا کے آثار پیدا کرے۔ قرآن میں ذات باری کی تعریف نہایت مشرح اور صاف ہے اور جو مذہب اس نے ان خوبیوں کے ساتھ قائم کیا ہے وہ وحدانیت الٰہی کا نہایت پختہ اور شدید یقین ہے اور بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو فلسفیانہ طور پر صرف ایسا مسبب الاسباب مان لیا جاوے جو اس عالم کو اپنے مقررہ قوانین پر چلا کر خود ایسی شان و عظمت کے ساتھ الگ ہے کہ اس تک کوئی شئے نہیں پہونچ سکتی۔ قرآن کی رو سے وہ ہر وقت حاضر و ناظر ہے اور اس کی قدرت کاملہ ہمیشہ اس عالم میں عامل اور متصرف ہے۔ علاوہ ازیں اسلام ایسا مذہب ہے جس کے اصول میں کوئی امر متنازعہ فیہ نہیں۔ اور چونکہ اس میں کوئی ایسا معمہ نہیں جو سمجھ میں نہ آئے اور زبردستی قبول کرنا پڑے اس لئے وہ لوگوں کے خیالات کو ایک سیدھی سادی اور ایسی پرستش پر قائم رکھتا ہے جو تغیر پذیر نہیں ہے۔ حالانکہ تیز و تند اور اندھا دھند جوش مذہبی نے پیروان اسلام کو اکثر اوقات آپے سے باہر کر دیا ہے۔"

"سب سے آخر یہ بات ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے کہ جس سے ولیوں، شہیدوں اور تبرکات اور تصویروں کی پرستش اور ناقابل فہم باتیں اور حکیمانہ باریکیاں اور راہبوں کی تجرید اور تعذیب نفس بالکل خارج کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ اسلام میں ایسے ثبوت موجود ہیں جن پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بانی نے ماہیت اشیا اور اس زمانہ کی قوموں کی حالت اور نیز اس امر پر کہ مسائل مذہبی عقل سے کیونکر مطابق ہو سکتے ہیں ایک طویل اور عمیق غور کے بعد اپنے مذہب کی بنا ڈالی ہے اور اس وجہ سے یہ کچھ محل تعجب نہیں ہو کہ اسلامی طور کی پرستش اہل کعبہ کی بت پرستی اور صابئین کی پرستش اجرام فلکی

اور زردشتیوں کی آتش پرستی پر غالب آگئی"
چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار مذہب اسلام کے متعلق لکھتا ہے۔ (معجزہ قرآن مجید صفحہ ۱۶)
"مذہب اسلام کا وہ حصہ جس میں بہت کم تغیر و تبدل ہوا ہے (بلکہ نہیں ہوا ہے۔ مقرر)
اور جس سے اُس کے بانی کی طبیعت صاف صاف معلوم ہوتی ہے اس مذہب کا نہایت کامل اور روشن حصہ ہے۔ اس سے ہماری مراد قرآن کے علم اخلاق سے ہے۔ ناانصافی۔ کذب۔ غرور۔ انتقام۔ غیبت۔ استہزا۔ طمع۔ فضول خرچی۔ عیاشی۔ خیانت اور بدگمانی نہایت قابل ملامت قرار دی گئی ہیں اور ان کو قبیح اور بے دینی بتایا ہے۔ بمقابلہ ان کے خیراندیشی۔ فیض رسانی۔ پاکدامنی۔ حیا۔ تحمل۔ صبر۔ کفایت شعاری سچائی۔ راست بازی۔ عالی ہمتی۔ صلح پسندی اور سچی محبت اور سب سے بڑھ کر توکل بخدا اور انقیاد امر الٰہی کو حقیقی ایمان داری کی اصل بنیاد اور مومن صادق کا اصلی نشان قرار دیا ہے۔"
اوسی مکمل کتاب اور بے نظیر کلام الٰہی کے متعلق مشہور ذمہ دار برطانیہ مسٹر گلیڈ سٹون بھرے مجمع میں اس کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے کہتا ہے
"جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔"
انہیں علوم اور مدارس کے مٹانے اور مہلک علوم جدیدہ کو شائع کرنے کے لئے لارڈ میکالے کہتا ہے:
"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو اگر رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں تو دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی" (مدینہ بجنور ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء)
باوجودیکہ ہندوستان میں برطانوی حکومت سے پہلے ہر ہر قریہ اور دیہات میں مشرقی علوم کے مدارس موجود تھے جیسا کہ سر تھامس منرو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے:
"ہندوستانیوں کا طریقہ کاشتکاری، بے مثل صنعت و حرفت، ان کی صنعت و کاشتکاری کے معاملہ میں اعلیٰ استعداد، ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی

جس میں نوشت وخواند اور حساب کی تعلیم ہوتی ہو، ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو اس کی عزّت عصمت، اور عفت کا پوری طرح لحاظ رکھا جاتا ہو یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب وتمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہونچے گا" (دیکھو حکومت خود اختیاری)

مگر برطانوی حکومت نے اُن مدارس کو اپنی ناپاک اور رجس پالیسی کی بنا پر تباہ وبرباد کر دیا۔ مسٹر لڈلو اپنی تاریخ برطانوی ہند میں لکھتا ہے :-

مجھے یقین ہے کہ ہندوؤں کے ہر گاؤں میں جو اپنی قدیم شان اور حیثیت کو قایم رکھے ہوئے تھا عام طور پر بچّے لکھ پڑھ سکتے تھے اور حساب میں بھی انہیں خاص مہارت ہوتی تھی۔ لیکن ہم نے بنگال کی طرح جہاں جہاں دیسی سسٹم کو فنا کر دیا ہے اُس جگہ دیسی مدرسے بھی فنا ہو گئے"۔ (حکومت خود اختیاری)

جبکہ ہندوؤں کے ہر ہر گاؤں میں بچّے عام طور پر لکھے پڑھے ہوئے ہوتے تھے اور مدارس قائم تھے تو مسلمانوں کے گانوں میں اور ان کی اولاد میں کہیں زیادہ تعلیم گاہیں اور علم وہنر ہوگا کیونکہ مسلمانوں کا مذہب تعلیم وتعلم کو فرض قرار دیتا ہے نیز وہ اُس وقت تمام سیاست اور نظام کے مالک تھے۔ آنریبل مسٹر الفنسٹن اور ایف وارڈن نے ۱۸۲۴ء اور ۱۸۲۳ء میں مسئلہ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی تھی جس میں انہوں نے اُس نقصان کو تسلیم کیا جو ملک کو انگریزوں کی ذات سے پہونچا تھا ان کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخیرے نسیا منسیا ہوتے جاتے ہیں اس

الزام کے رفع کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔" (حکومت خود اختیاری)
اس سے صاف ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کے ابتدائی ہی حصّہ میں برطانوی مدبرین نے مدارس اور تعلیم گاہوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ملک ہند سے علمی ذخایر کو معدوم کر کے عام ہندوستانیوں کو جاہل بنا دیا تھا۔ برطانوی ناپاک پالیسی کا ہمیشہ سے تقاضا یہی رہا ہے کہ وہ ہندوستانیوں میں کسی قسم کے علوم کو بھی رائج نہونے دے۔ سر ولیم ڈگبی اپنی کتاب پراسپرس برٹش انڈیا میں میجر جنیل اسمتھ کے سی بی کی شہادت قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے

سوال عـ ۵۶۳ کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسیوں کو ان کی طاقت کا علم نہو۔

جواب - میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں (غالباً یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں تمام ملک نہیں آیا تھا) جسے آج کل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لئے جونہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے ہم نے اب تک اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو ہندؤں کے خلاف کرنا اور علی ہذا القیاس تعلیم کا یہ اثر ضرور ہوگا کہ ان کے دل بڑھ جائیں گے اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائیگی۔"

الغرض برطانیہ نے ابتدا ہی سے علم اور ذرائع علم کو اپنی اغراض فاسدہ اور خبث پالیسی کی بنا پر فنا کر دیا اور جب بہت زیادہ شور و شغب اس کے لئے بپا ہوا تو ایسی تعلیمات اور درس گاہیں کھولیں اور ایسا پروگرام بنایا جو کہ اس کے ناپاک مقاصد کے لئے معین و مددگار بنکر ہندوستانیوں کے لئے حقیقی زندگانی کی راہ میں کانٹا ہو جائے۔ چنانچہ موجودہ تعلیمات پر غور و فکر کرنے والا آدمی بخوبی پہچان سکتا ہے۔ مگر اس پر بھی صنعتی تعلیمات سے نہایت ہی زیادہ سرد مہری برتی جاتی ہے اور معمولی لکھنے پڑھنے والے فی صدی دس آدمی بھی تمام ہندوستان میں نظر نہیں آتے فی صدی پانچ بھی تعلیم پر خرچ کرنا گورنمنٹ کو نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ معمولی نوشت و خواند کی یہ حالت ہے تو اسلامی

علوم و فنون سے جس قدر بھی دشمنی تسلیم کی جائے بیجا نہو گی۔ یہی وجہ ہوئی کہ ۱۸۵۷ء تک تمام ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا وجود ناپید ہو چکا تھا اور بچے کچھے علمار اسلام کو خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں فنا کیا گیا۔ اب حالت اس درجہ کو پہونچ گئی تھی کہ مذہب اسلام کی حفاظت اور بقار کی کوئی بھی صورت نہ تھی وہ نام کے اسلامی مدارس بھی باقی نہ تھے جن سے کسی قسم کی اشک شوئی کی جاسکتی۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے ہر قسم کا علمی ذخیرہ بلکہ نفس اسلام کی تعلیم عربی اور فارسی ہی زبان میں تھی اور ہے بغیر اس کی تعلیم کے جاری ہونے کے اسلام کا ہی بقار ناممکن تھا اس لئے بقیۃ السیف علمار کو ضروری معلوم ہوا کہ پوری جد و جہد کے ساتھ مذہبی علوم اور اسلامی فنون کو ملک میں جاری کریں۔ یہ بدیہی امر ہے کہ مسلمان اگر کیسی ہی ترقی مال و دولت، حکومت و تجارت وغیرہ میں کریں مگر اسلام اور اس کے احکام سے نابلد اور ناواقف ہوں تو وہ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی۔ چہ جائیکہ وہ نجات اور فایز المرامی کے مستحق ہوں۔ ارباب ہمم اسی ضرورت کو محسوس کر کے خدا کے نام پر اٹھے قوم کو اس طرف متوجہ کیا۔ ہر قسم کی صعوبتیں جن کے وہ کبھی عادی نہ تھے برداشت کیں اور اسلامی مدارس کی بنیاد ڈالی۔ متقدم مدارس میں دار العلوم دیوبند چند پاکیزہ ہستیوں کی جد و جہد سے قائم ہوا۔ اور وہ تدریجی ترقی کرتا ہوا تھوڑے ہی عرصہ میں مرکز شان پر فایز ہو گیا۔ اسی طرح سہارنپور کا مدرسہ مظاہر العلوم اس کے چھ ماہ یا کم و بیش زمانہ کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ نیز مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم، مدرسہ امدادیہ، نگینہ، روڑکی، امروہہ، گلاؤٹی، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر، دہلی، کانپور، لکھنؤ، بنارس، مبارکپور، مئو، الٰہ آباد، بریلی، شاہجہانپور، خورجہ، رامپور وغیرہ وغیرہ میں مذہبی مدارس قائم کئے گئے اور تمام علوم و فنون اسلامیہ عربی زبان کے تعلیمی طور پر رائج کئے گئے جن سے ہزاروں ہزار علمار مختلف استعداد اور قابلیت کے پیدا ہوئے۔ جنہوں نے مذہب اسلام کے تحفظ اور اس کی تبلیغی خدمات میں کم و بیش حصہ لیا۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ کیا جاتا تو یقیناً آج ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اسلام کا نام تک بھی باقی نہ رہ جاتا۔ یوپی کے

علاوہ صوبۂ بنگال، آسام، بہار، مدراس، بمبئی، سندھ، پنجاب، فرنٹیئر، برار وغیرہ میں بھی بیداری روز افزوں ترقی پذیر ہوئی اور یکے بعد دیگرے مدارس قائم ہوئے جن سے ان صوبوں کے مسلمانوں کا تحفظ بڑے درجہ تک عمل میں آیا۔

میرے محترم بزرگو! ایک ایسے ملک میں جہاں سے حکومت اسلامیہ کا ظلّ خداوندی اٹھ گیا ہو۔ اس کی جگہ قائم ہونے والی حکومت پردیسی اور غیر مسلم ہو۔ اس کی پالیسی یہ ہو کہ وہ مسلمانوں کی قوم اور مذہب کو اپنا دشمن سمجھتی ہو۔

جیسا کہ گورنر جنرل ہند لارڈ الن برا ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھتا ہے:

"میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے۔ اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضاجوئی کرتے رہیں۔"

(دی ہیپی انڈیا صفحہ ۳۹۵)

ہنری ہیرنگٹن طامس (بنگال کا سویلین) اپنے رسالہ (ہندوستان میں گذشتہ بغاوت اور ہماری آئندہ پالیسی) میں لکھتا ہے:

"وہ (مسلمان) خلیفۂ اوّل کے وقت سے موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ مغرور غیر رواداری اور ظالم رہے ہیں۔ ہمیشہ ان کا مقصد یہ رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشوونما ہو۔ مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔" (حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۵و۵۶)

اگر مسلمان حاکم کے علاوہ اور کوئی ان کا فرماں روا ہو تو وہ خود کو ایسی حالت میں پاتے ہیں کہ جس پر راضی ہو جانا ان کی ضمیر کے خلاف ہے اس لئے اعزاز و مراعات سے انہیں خوش رکھنا ناممکن ہے مگر انہیں نمایشی وفاداری کا ڈھب خوب آتا ہے اور وہ موقعہ کے منتظر رہتے ہیں۔ . . . لیکن عیسائیوں کے ساتھ اس طبعی منافرت کے علاوہ اور بھی وجوہ تھے جن کے باعث ہندوستان کے مسلمان ہماری بربادی کے خواہاں تھے۔ وہ بھولے نہ تھے کہ کئی پشت تک ہندوستان ان کے زیرنگین

رہ چکا تھا اور پھر انہیں یقین تھا کہ برطانیہ کی قوت اگر کامل طور پر برباد ہوگئی تو ان کی عظمت رفتہ رفتہ واپس آجائے گی اور وہ دوبارہ ہندوؤں پر حکومت کر سکیں گے۔

ہندوستانی فوج میں جو بد دلی پھیل رہی تھی اس کو انہوں نے تاڑ لیا اور اپنی ریشہ دوانیوں سے اس چنگاری کو بھڑکا کر آگ لگا دی" (حکومت خود اختیاری ص۹۳)

الغرض خلاف واقع طور پر حکومت موجودہ کے ذمہ دار حکام ہمیشہ سے صرف اسلام اور مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن اور انقلاب ۵۷ء کا ذمہ دار انہیں کو سمجھ کر ان کی ہر قسم کی عظمت اور شوکت اور ان کی رفاہیت اور خوشحالی، قوت اور مذہبیت کو مٹانے کے درپے رہے اور اس امر سے چشم پوشی کرتے رہے کہ انقلاب ۵۷ء کا ذمہ دار خود انگریزوں کا وہ طرز عمل ہے جس کو یوروپین تعلیم اور ان کا جدید تمدن پھیلا رہا تھا اور اُس پر عملدرآمد انگریز کر رہے تھے اور وہی آج بھی تمام ملک میں بےچینی کی آگ بھڑکائے ہوئے ہے اُسی کو لفٹنٹ گورنر جنرل میک لیوڈ انیس نے اپنی کتاب (بغاوت فوج) میں لکھا اور تسلیم کیا ہے۔

اس کا اصول یہ ہو کہ ہندوستان کے خون کو روز بروز چوسا جائے اور ان کی ہر قسم کی دولت و رفاہیت اور ان کے ذرائع کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے اس کی ایسی ہی پالیسیوں کی وجہ سے ہندوستان روز بروز بد سے بدتر حالت میں پہونچتا جا رہا ہو چنانچہ مسٹر ڈبلو جی پیڈر ۱۸۷۳ء میں لکھتا ہے:

"ایک ایسی رائے جس پر تقریباً ہر شخص متفق ہے اگر قابل اعتماد ہوسکتی ہے تو یہ صحیح ہے کہ اہل ہند ہمارے زیر حکومت بد سے بدتر حالت کو پہونچتے جاتے ہیں یہ نہایت اہم مسئلہ ہے جس پر حکومت کو توجہ کرنا چاہئے۔" (حکومت خود اختیاری ص۳۰)

ایچ۔ ایم۔ ہنڈمین (مشہور ماہر اقتصادیات) لکھتا ہے:

ہندوستان روز بروز کمزور و ناتواں ہوتا جا رہا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی زندگی کا خون آہستہ آہستہ مگر دن بدن تیزروی کے ساتھ نکلا جا رہا ہے"

(ایچ ایم ہنڈمین بینک کرپٹ سی آف انڈیا ص۱۵۲)

اس نے اپنی ناپاک اور نجس پالیسی کی بنا پر اس ملک کو انتہائی افلاس اور نکبت میں

بتلا کر دیا ہو۔ ابھی ابھی میں سر جان شور کا مقالہ نقل کر آیا ہوں کہ وہ ۱۸۳۳ء میں کہتا ہے کہ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ مسٹر فلپ فرانسس ممبر بنگال کونسل کہتا ہے:

"ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہیئے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہو اہل ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی۔ اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جنکی وجہ سے یہ ملک ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت کے زیر سایہ تو سرسبز ہوتا رہا مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارہ پر پہونچ گیا۔" (ان ہپی انڈیا صفحہ ۳۴۴)

مسٹر سیول میرٹ ممبر کونسل ۱۸۳۶ء میں لکھتا ہے:

"برطانیہ کا دور حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہونچ گیا ہے اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ لوگ اس وقت خوش حال تھے یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی کو پہونچ گیا ہے۔"

وہ بقول مسٹر ریمزے میکڈانلڈ قحط اور افلاس سے ستائے ہوئے لوگوں کی بستی بن کر رہ گیا ہو اور بقول سر جان سائمن اس کی تمام آبادی انتہائی افلاس میں مبتلا ہو اور بقول مسٹر ہیٹر فرمین اس میں چار کروڑ سے لیکر سات کروڑ تک آدمی مسلسل فاقہ کشی میں مبتلا کر دیئے گئے ہوں اور بقول مسٹر اے اے برسل تقریباً آبادی کا ۳/۴ حصہ کبھی پیٹ بھر کر چانول بھی نہ پاتا ہو۔ جن میں حکومت کا گوشۂ خاطر عام طور پر جہالت پھیلاتا ہو عام طور پر اہل ثروت وحکومت ملکی اور اسلامی باقی نہ رہے ہوں۔ علوم اسلامیہ کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو عہدہ ہائے حکومت نہ دیئے جاتے ہوں ان مدارس اور ان کے طلبہ اور مدرسین کو کوئی امتیازی شان حاصل نہو نہ ان کی ہمت افزائی اور پرورش کا کوئی سامان ہو اور نہ کوئی مالی امداد ملتی ہو جس ملک میں الحاد اور زندقہ کی مغربی باد صرصر دن ورات چل رہی ہو ہوا پرستی اور ضلالات و بدعات کی وباؤں نے عام طور پر مزاجوں کو ماؤف بنا دیا ہو، عام طور پر مسلم آبادی انتہائی فقر و فاقہ میں مبتلا کر دی گئی ہو۔

ان جملہ امور اور ایسے ہی دیگر حالات میں مدارس اسلامیہ کا اس ملک ہندوستان میں قائم ہونا اور باقی رہنا کس قدر مشکل اور دشوار ہوگا۔ اگر غور و فکر کو کام میں لایا جائے اور عالم اسباب اور ظاہر بینی کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو ان علوم اور درس گاہوں کا باقی ہی رہنا نہایت محال معلوم ہوتا ہے۔ اور ضروری طور پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بھی قرآن کا معجزہ اور حضرت خاتم النبین علیہ السلام کی کھلی ہوئی برکت ہے۔ انہیں سخت سی سخت دشوار گذار گھاٹیوں کے اندر گذرتا ہوا دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس آہستہ آہستہ ترقی پذیر رہے۔ آج تک دارالعلوم دیوبند اپنی عمر کے بہتر ۷۲ سال پورے کر کے بارہ ۱۲ تیرہ ۱۳ ہزار عالم پیدا کر چکا ہے اور اطراف و اکناف عالم میں انہیں علماء کے ذریعہ سے اسلام اور سنن نبویہ (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و تحیۃ) کی نشر و اشاعت کرتا ہوا حسب الاستطاعت کفر و الحاد، زندقہ اور افساد، بدعات اور ضلالات کو روک رہا ہے اگرچہ مسلمانوں کی بے توجہی اور ان کے فقر و فاقہ اور عدم احساس کی بنا پر وہ کما ینبغی اور حسب خواہش کارکنان ترقی نہ کر سکا مگر تاہم مجموعی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ وہ آج تمام عالم اسلامی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف صوبوں اور اطراف و اکناف عالم میں علوم اسلامیہ کی روشنی پھیلائی ہے بلکہ بیرونی ممالک افغانستان، بلوچستان، عراق، حجاز، شام، وسط ایشیا، ترکستان چینی، ترکستان روسی، قازان، اشام، یمن، برہما، جزائر سماٹرا وجاوا وغیرہ میں بھی ہزاروں تعلیم یافتہ بنا دیئے ہیں۔ صوبہ بنگال جو کہ بحیثیت آبادی ہندوستان میں سب سے بڑا اور زرخیز صوبہ ہے اس سے بہت ہی زیادہ مستفید ہوتا رہا ہے۔ اس وقت تقریباً بارہ سو طلبہ سے زاید اس میں تعلیم پا رہے ہیں۔ طلباء پر کسی قسم کا ٹیکس اور فیس کا بوجھ نہیں رکھا جاتا بلکہ تقریباً پانچ سو طلبہ سے کچھ زاید کی تمام ضروریات کا تکفل کیا جاتا ہے۔ اگر مالی استطاعت پوری ہوتی تو ضرور اس میں ہر قسم کے ضروری شعبے اور لوازمات زندگی و طالب علمی کے سامان مہیا کئے جاتے۔ طلبہ کے لئے قیام گاہیں وغیرہ پورے پیمانہ پر موجود ہوتیں۔ دیگر عمارات مختلفہ اور کتابیں وغیرہ حسب ضرورت تیار کی جاتیں

مگر سرمایہ کی قلت ہر طرف قدم بڑھانے سے سدراہ بنتی ہے۔ عربی تعلیمات کے لئے نصاب میں جو جو ضرورتیں ارباب حل وعقد کے ذہن میں آتی جاتی ہیں ان کی ترمیم وتنسیخ زیادتی اور کمی وغیرہ ابتداہی سے جاری ہے۔ اگر قدیم نصاب تعلیم (جس کو درس نظامی سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور موجودہ نصاب کا مقابلہ کیا جائے تو اس قدر بیّن فرق معلوم ہوگا کہ گویا کہ دو نصاب علٰحدہ علٰحدہ تجویز کئے گئے ہیں۔ موجودہ نصاب میں علم حدیث اور علم تفسیر کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

انگریزی خواں طلبہ کے لئے یہ مناسب ہے کہ فنون میں جو متعدد کتابیں تقویت استعداد اور حفظ مسائل کے لئے رکھی گئی ہیں ان کو کم کر دیا جائے یا جن فنون کو انہوں نے انگریزی زبان میں حاصل کر لیا ہے ان کو حذف کر دیا جائے۔

اور بہت ہی زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معروضۂ ذیل امور کی طرف خصوصی توجہ منعطف کی جائے:

چونکہ اسلامی تعلیمات، اسلامی تواریخ، اسلامی معاشرت، اسلامی تمدن اسلامی علوم وفنون یہ سب عربی زبان میں ہیں، اس ساڑھے تیرہ سو برس میں مسلمانوں نے بڑے بڑے مذہبی اور تمدنی انقلابات برپا کئے ہیں اور علوم وفنون کے بہت سے شعبوں میں مسلمانوں کا مستقل اور پائیدار اثر قائم ہوا ہے۔ اور یہ سب کچھ عربی زبان میں ہے۔ مسلمانوں کے خاص خاص علوم ہیں جو اور کسی زبان میں پوری طرح نہ منتقل ہو سکتے ہیں نہ ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسے حدیث، تفسیر، اصول، اسماء الرجال، وغیرہ الغرض مسلمانوں کا سارا علمی سرمایہ عربی زبان میں ہے اس لئے من حیث القوم مسلمان عربی تعلیم کے لئے مجبور ہیں، نہ اس کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ان کو چھوڑنا چاہیئے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ صرف ہندوستان میں شاید کئی لاکھ مسلمان ہر سال عربی تعلیم میں مشغول رہتے ہیں اور ہر سال ہزاروں طالب علم آٹھ دس برس کی محنت شاقہ کے بعد سند فراغ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لئے بظاہر معاش کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہی لوگ قومی اور مذہبی رہنما اور قومی رہبر ہوتے ہیں مگر معمولی بسر اوقات اور اپنی قوت

سے قدر کفاف حاصل کرنے کا موقع بھی ان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رہنما ہوتے ہیں مگر محتاج، رہبر بنتے ہیں مگر مفلس۔ اور احتیاج کی وجہ سے جو جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ ہوتی رہتی ہیں۔

یہ چیز ناممکن ہے کہ مسلمانوں کو عربی تعلیم سے روک دیا جائے۔ اور روکنا مناسب اور جائز بھی نہیں ورنہ یہ مسلمانوں کی مذہبی اور ملّی تباہی کا باعث ہو جائے گا۔ لہٰذا ایک مسلمانوں کی اس تعلیمی کانفرنس کے لئے یہ امر غور طلب نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی عربی تعلیم کے مسئلہ کی طرف اپنی مکمل توجہ منعطف کرتی ہوئی عربی تعلیم یافتہ اشخاص کے ذرائع معاش کے مسئلہ کو حل کرے۔

یقیناً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اس مسئلہ سے اب تک بہت بڑی غفلت برتی ہے۔ شکایت کی جاتی ہے کہ اچھے علمار پیدا نہیں ہوتے مگر اچھے علمار پیدا ہونے کے اسباب و ذرائع کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے لو کلفت بصلۃ ما عرفت مسئلۃ (اگر مجھ کو پیاز کی تکلیف دیجاتی تو ایک مسئلہ کو بھی نہ پہچانتا) ضروری ہے کہ علمار کو احتیاج اور افلاس سے نکالا جائے۔ ان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی روزی اپنے قوت بازو سے حاصل کر سکیں تاکہ ان میں فارغ البالی، خودداری، آزادی رائے پیدا ہو سکے اور ہر چہ خورد بابداد فرزندم سے فی الجملہ آزاد ہو جائیں۔ یہ امر مشکل نہیں ہے مگر اس کے لئے متفقہ قومی آواز کی ضرورت ہے۔ مسلم تعلیمی کانفرنس کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ مجھ کو قوی امید ہے کہ پوری مسلم قوم اس مسئلہ میں کانفرنس کا ساتھ دے گی۔ میں فی الحال حسب ذیل تجاویز عربی تعلیم یافتوں کے لئے پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں:

(۱) کچھ کچھ معتد بہ وظائف ان طلبہ کے لئے مقرر کئے جائیں جو عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انگریزی پڑھنا چاہیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس انگریزی مدارس کے اُن فارغ شدہ طلبہ کے لئے بھی جو عربی پڑھنا چاہیں ان کے لئے بھی وہ وظائف امدادیہ جاری کئے جائیں۔

(۲) جس طرح مولوی فاضل وغیرہ کے سند یافتہ صرف زبان انگریزی میں گورنمنٹ

امتحانات میں شرکت حاصل کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح مسلم یونیورسٹی اپنے یہاں ایسے قوانین بنائے جن کی رو سے عربی مدارس کے فارغ شدہ طلبہ صرف زبان انگریزی کے امتحان میں شامل ہو سکیں۔ ان کے لیے تعلیم کا مستند انتظام کیا جائے کہ ایف اے کے بعد وہ بی اے کا امتحان دے سکیں۔

(۳) عربی مدارس کے طلبہ کے لئے ریلوے وغیرہ سے وہ تمام مراعاتیں ملنی چاہئیں جو انگریزی مدارس کے طلبہ یا ایڈ گرفتہ مدارس کے طلبہ کو ملتی ہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس مستند مدارس عربیہ کی ایک فہرست تیار کرے جس کو گورنمنٹ بھی تسلیم کرے۔

(۴) قانون کے امتحانوں میں انگریزی زبان دانی کی شرط نہ رکھی جائے۔ امتحانات ملکی زبانوں میں ہوں۔ علمی استعداد شرط کی جائے مگر حسب مراتب جن امتحانوں کے لئے میٹرک، انڈر گریجویٹ، یا گریجویٹ کی شرط ہے وہ رکھی جائے اور اُسی درجہ کے عربی اسنادوں کو بھی کافی سمجھا جائے۔ عربی نصاب میں اس کے لئے مدارج قائم ہو سکتے ہیں اور بعض ضروری چیزوں کا نصاب میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

(۵) کورٹ کی لینگویج بدل دی جائے۔ اگر فوراً ہائی کورٹ کی زبان بدلی نجا سکے تو وہ انگریزی ہی رہنے دی جائے لیکن دوسرے تمام کورٹوں کی زبان لازمی طور پر بدل دی جائے۔

(۶) رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں عربی کی اسناد کو بھی ملازمت کے لئے کافی سمجھا جائے۔

(۷) اوقاف کے تمام ذمہ دار عہدوں کے لئے عربی اور مذہبی تعلیم کی تکمیل ضروری سمجھا جائے اور شرط کر دی جائے۔

(۸) محکمہ منصفی او ججی (صدارات اعلیٰ) کے لئے جس میں اکثر قضاء شرعی اور تقسیم وراثت وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے مذہبی تعلیم کی سند ضروری قرار دی جائے۔

(۹) مسلمانوں کو محکمہ قضاء حسب طلب عطا کیا جائے۔ جس کا مطالبہ عرصہ دراز سے مسلمان کر رہے ہیں۔

(۱۰) آرٹ اور صنعت کی تعلیم میں عربی تعلیم [illegible] کو شامل [illegible] قرار دیا جائے۔

(۱۱) محکمہ ہائے انہار، زراعت، تجارت کی تعلیمات میں عربی تعلیم یافتوں کو شریک کیا جائے۔
(۱۲) یونیورسٹیوں کے وہ طلبہ جو عربی پڑھتے ہیں تھوڑے دنوں کے لئے کسی عربی دینی مدرسہ میں جاکر قیام کیا کریں اور عربی کی اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کریں۔

محترم حضرات! میں نہایت عدیم الفرصت اور بہت ہی کم مایہ ہوں۔ بہت کم فرصت میں نہایت جلدی کے ساتھ قلمبند کرکے اپنے مختلف پریشان خیالات کو آپ حضرات کی بارگاہ میں پیش کر رہا ہوں اور امیدوار ہوں کہ اپنی نظر عفو و کرم کو کام میں لاکر اگر کوئی چیز خلاف رائے یا باعث تکدر ہوئی ہو اس سے سماح فرمائیں گے۔

آخر میں میں پھر آپ حضرات کی عنایات بے غایات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ میری عرائض کو اپنی توجہات مربیانہ اور الطاف ہائے بیکرانہ سے نوازینگے۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ
خادم العلوم بدار العلوم دیوبند

خطبۂ صدارت

از

مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) شعبہ لٹریسی و تعلیم بالغان

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر شعبہ کا ایک علیحدہ صدر اور مستقل سکرٹری تھا۔

من جملہ ان شعبوں کے ایک شعبہ لٹریسی و تعلیم بالغان تھا، جس کے صدر مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) سابق آنریری جائنٹ سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور سکرٹری سید تجمل حسین صاحب ایم اے پروفیسر ٹریننگ کالج (مسلم یونیورسٹی) تھے۔

اس شعبہ کا اجلاس ۲۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۸ بجے شب آسمان منزل میں منعقد ہوا، اس موقع پر مولوی سید طفیل احمد صاحب نے بحیثیت صدر شعبہ جو خطبہ پڑھا وہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ صدارت

از

مولوی سید طفیل احمد صاحب شعبۂ خانگی تعلیم بالغان

آپ کو معلوم ہو گا کہ اس شعبہ کے صدر جناب سید بشیر حسین صاحب زیدی مقرر ہوئے تھے جو کیا بہ اعتبار اپنی قابلیت علمی کے اور کیا بہ اعتبار اپنے اعلیٰ مرتبہ کے اس جگہ کے لئے مناسب اور بہترین شخص ہیں۔ سوء اتفاق سے کل شام اُن کا تار آ گیا کہ وہ علیل ہیں اور نہیں آ سکتے۔ اس لئے جناب سید تجمل حسین صاحب سکرٹری شعبہ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس عہدہ کے فرائض انجام دوں۔ کاش میں اس خدمت کے کچھ بھی قابل ہوتا تو مجھے اس عزت سے خوشی ہوتی۔ مگر اب تو بجز حیرانی اور پریشانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ بہر حال مجھ میں قابلیت ہو یا نہ ہو، میں اس جلیل القدر منصب کا اہل ہوں یا نہ ہوں۔ جناب سکرٹری صاحب اور آپ صاحبوں کی مہربانی سے میرا نام اجلاس جوبلی کانفرنس کے شعبوں کے پریسیڈنٹوں میں لکھا جا سکا جس کا شکریہ ادا کرنا میرے امکان سے باہر ہے اور جو میری بقیہ زندگی میں میرے لئے قابل فخر و مباہات رہے گا۔

زمانۂ سابق میں خواندوں کی تعداد

آپ اصحاب اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اس وقت ترقی یافتہ ممالک میں خواندوں کی تعداد نوّے ۹۰ اور سَو ۱۰۰ فی صدی کے درمیان ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے ملک میں جو کسی زمانہ میں علم اور شائستگی کا مرکز رہ چکا ہے خواندوں کی تعداد صرف بقدر آٹھ فی صدی کے ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ہمیشہ سے اس ملک کی جہالت کی یہی حالت رہی ہے یا کسی خاص زمانہ سے ہے۔ ڈاکٹر لٹنر نے جو پنجاب یونیورسٹی کے پہلے مشہور پرنسپل رہے ہیں صاف الفاظ میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ زمانۂ سابق میں اس ملک میں خواندوں کی تعداد بمقابلہ اب کے بہت زیادہ تھی۔

اسی طرح مسٹر کیر ہارڈی سابق ممبر پارلیمنٹ نے اپنی کتاب میں میکس مولر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسّی ہزار مدرسے تھے۔ اس طرح چار سو ۴۰۰ آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔ نیز لڈلو نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ "یہاں کے ہر موضع میں جو اپنی قدیم حالت پر قائم ہے بچّے بالعموم لکھ پڑھ سکتے ہیں مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پُرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں گاؤں سے اسکول غائب ہو گیا ہے۔"[۱]

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے پُرانے نظام میں یہاں کے لوگ تعلیم کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ دیہات کے ہر مذہب کے لوگ اپنی اپنی تعلیم کا انتظام پنچایتی طریقہ سے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق خود کرتے تھے۔ اُسی کے ساتھ امرا اور حکامِ وقت بلا لحاظ مذہب و ملّت کے اپنی رعایا کے تعلیمی اور خیراتی کاموں کے لئے اوقاف کرتے رہتے تھے۔ بدقسمتی سے اس وقت سے پونے دو سو سال قبل جب یہاں کا نظامِ سلطنت بدلا تو اُس میں نہ صرف یہ کہ حکومت کی امدادیں ملنی بند ہو گئیں بلکہ پُرانے اوقاف بھی ضبط کر لئے گئے اور پُرانا پنچایتی نظام توڑ دیا گیا جس سے یہاں کی تعلیم بھی برباد ہو گئی۔

مسلمانوں اور کمپنی کی تعلیمی پالیسی کا موازنہ

موجودہ عملداری سے قبل یہاں مسلمانوں کی عملداری تھی جن کی نسبت اب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے متعصب اور مذہبی مجنون تھے مگر اُن کی

---

[۱] تاریخ میجر باسو صفحہ ۲۰۳

جو پالیسی تھی اُس کا اندازہ آپ کو مسٹر چارلس گرانٹ کے رسالہ سے ہوگا جو انھوں نے ۱۷۹۳ء میں لکھا تھا۔ اُس میں اُنھوں نے صاف الفاظ میں یہ تسلیم کیا تھا کہ:

”مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوؤں کے کیریکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی اور اُنھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔“

مگر چارلس گرانٹ چاہتے تھے کہ وہ اس بارہ میں مسلمانوں کی پیروی نہ کریں اور یہاں کے لوگوں کو اپنی زبان پڑھا کر عیسائی بنائیں۔

ہندوستان کے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لئے انگریزی پڑھانے کا مسئلہ سب سے اوّل ۱۷۹۲ء میں مسٹر ولبر فورس نے پارلیمنٹ میں پیش کیا جو اس بنا پر خارج کردیا گیا کہ ایسا نہ ہو کہ امریکہ والوں کی طرح ہندوستان کے لوگ تعلیم یافتہ ہو کر آزادی کے طلب گار ہوجائیں جس سے کمپنی کی عملداری کا خاتمہ ہوجائے۔ بس یہی اندیشہ تھا جس کی وجہ سے مدت دراز تک کمپنی والوں نے کسی قسم کی تعلیم کی طرف توجہ نہ کی۔ البتہ پرائیویٹ طور پر پادری لوگ ہندوستان میں آکر اپنے مذہب کی اشاعت کی غرض سے کچھ مدارس قائم کرتے رہے اور پھر کمپنی کی طرف سے بھی اسی کام کے لئے پادری مقرر ہوئے اور حکام نے اُن کی امداد کی۔

تعلیمی کمیٹی کا تقرر

البتہ خاص ہندوستانیوں کی ضروریات کے لئے اٹھارہویں صدی کے آخر میں دو بڑے شہروں میں دو مدرسے قائم کئے گئے۔ ایک مسلمانوں کے لئے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ قائم کیا گیا۔ دوسرا ہندوؤں کے لئے ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج بنارس قائم ہوا۔

۱۸۱۳ء میں سب سے پہلی بار ایک تعلیمی کمیٹی صوبۂ بنگال میں قائم کی گئی جس کے لئے کل ایک لاکھ روپیہ سالانہ منظور کیا گیا جو تمام عملداری کے لئے بمنزلہ اشک بلبل کے تھا۔ مگر لطف یہ ہے کہ وہ دس سال تک خرچ بھی نہ کیا گیا۔ لیکن غنیمت ہے کہ ۱۸۲۳ء میں حکام وقت کو اہل ہند کی جہالت کا احساس ہوا اور آنریبل ایم الفنسٹن اور ایف وارڈن نے اپنی متفقہ یادداشت میں تسلیم کیا کہ:

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اُس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ اُس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخیرے نسیاً منسیا ہوئے جاتے ہیں۔ اس الزام کے رفع کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے" تعلیمی کمیٹی کے اس روپیہ سے اُس وقت کے کالجوں کی امداد کی گئی اور آگرہ کالج قائم کیا گیا۔ مگر یہ سب کالج شہروں کے لوگوں کے لئے تھے اور اُن کی تعلیم کی نوعیت ایسی تھی کہ اُس سے طلبار اپنے مذہب میں کمزور ہو جاتے تھے اور اُس سے حکام وقت خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۳۱ء میں تعلیمی کمیٹی نے اپنی ہشت سالہ رپورٹ میں لکھا تھا کہ:

"ہندو کالج کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ کرنا اس تعلیمی کمیٹی کے خاص مقاصد میں سے رہا ہے۔ اس سے جو نتائج حاصل ہوئے وہ اُمید سے زیادہ ہیں۔ زبان انگریزی کی واقفیت میں ترقی کے ساتھ اخلاقی اثرات بھی نمایاں ہوئے اور اچھے خاندان اور قابلیت کے بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے بے چینی اور اپنے رسوم کی طرف سے بے اعتنائی کا علانیہ اظہار کیا جا رہا ہے۔ غالباً دوسری نسل میں کلکتہ کے ہندوؤں کے خیالات اور محسوسات میں بڑی مادّی تبدیلی ہو جائے گی"[۱]

حکام کی اس نیت اور طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا کو اُن کی طرف سے یہ بدگمانی ہو گئی کہ وہ اپنے مدارس کے ذریعہ سے اُنھیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں چنانچہ مدراس کے لوگوں نے جن میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے ۱۸۵۲ء میں گورنر صاحب مدراس کے خلاف پارلیمنٹ میں ایک شکایتی درخواست بھیجی کہ سرکاری روپیہ عیسائی بنانے میں صرف کیا جاتا ہے۔ یہاں تک تو اعلیٰ تعلیم کا تذکرہ ہوا۔

ابتدائی تعلیم کا انتظام

اب چند الفاظ ابتدائی تعلیم کی نسبت عرض کئے جاتے ہیں جس کی شروعات ۱۸۴۳ء میں ہوئی جب کہ حکام نے دیسی زبان کے مدارس قائم کرنے کی طرف توجہ کی اور (۱۰۱) مدارس کھولنے کا حکم دیا۔ مگر رعایا سرکاری تعلیم کی طرف سے اس قدر مشتبہ تھی کہ مدارس میں طلبار نہیں آئے، البتہ ۱۸۴۵ء میں سر ولیم میور لفٹنٹ

---

[۱] تاریخ التعلیم از سید محمود صفحہ ۳۵

گورنر نے خاص کوشش سے صوبۂ متحدہ کے آٹھ اضلاع کی تحصیلوں میں تحصیلی مدارس قائم کئے اور پھر اس سلسلہ کی توسیع مفصلات میں رفتہ رفتہ کی گئی۔

طلباء کو مدارس میں داخل کرانے کے لئے ڈپٹی انسپکٹران مقرر کئے گئے تھے جو دیہات میں گشت کرتے تھے اور سرکاری اثرات سے طلبا کو گھیر گھیر کر داخل کراتے تھے غرضیکہ عوام الناس کی تعلیم کی ابتدا ۱۸۴۵ء سے کی گئی جس سے ملک کے خواندوں کی تعداد بڑھی مگر چونکہ وہ تعلیم ہندوستانیوں کی روایات اور ضروریات کے خلاف تھی اس لئے بچے اُن مدرسوں میں نہ جاتے تھے۔ سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنے مشہور رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں رعایا کی ناراضی کا ایک سبب یہ مدارس بھی قرار دیئے تھے۔ سید صاحب موصوف کے الفاظ اس بارہ میں حسب ذیل ہیں:-

"دیہاتی مکاتب کی نسبت بھی لوگوں کو یقین تھا کہ وہ صرف عیسائی بنانے کو جاری ہوئے ہیں۔ گاؤں کے لوگ ڈپٹی انسپکٹروں کو اسی لئے کالا پادری کہتے تھے اور سمجھ دار آدمی جانتے تھے کہ وہاں اُن کے بچے صرف اردو پڑھ کر اپنی مذہبی تعلیم سے محروم ہو جائیں گے۔ چونکہ گورنمنٹ کے حکم سے بچوں کا داخلہ ہوتا تھا اس لئے لوگ سمجھتے تھے کہ سرکار کا ارادہ عیسائی بنانے کا ہے۔"

مسلمانوں کی تعلیم

تعلیم عامہ کی نسبت اس قدر عرض کرنے کے بعد اب کچھ حال مخصوص مسلمانوں کی تعلیم کا پیش کیا جاتا ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں رہا۔ اس کی بابت ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب "مسلمانانِ ہند" میں لکھا ہے کہ:

"انگریزی عملداری کے ابتدائی پچھتر سالوں میں ہم نے اپنے انتظامی عہدہ داروں حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو جاری رہنے دیا اور اس دوران میں اپنا سررشتۂ تعلیم مکمل کر لیا اور جوں ہی کہ ایک نسل تیار ہو گئی، ہم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اُٹھا کر پھینک دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم نوجوانوں پر ملازمت کے دروازے بند ہو گئے۔"

آگے چل کر اس پالیسی کا نتیجہ یہ لکھا ہے کہ:

"یا تو عدالت، پولس، کلکٹری اور فوج میں ہر جگہ مسلمان ہی مسلمان نظر آتے تھے اور یا اب ۱۸۷۱ء میں صوبۂ بنگال کے گزٹیڈ افسروں میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۱۳ فی صدی اور انجنیری اور دفاتر حسابات میں صرف ۴ فی صدی رہ گئی ہے"

تعلیم میں مسلمانوں کی کمی کی وجہ خود ڈاکٹر ہنٹر نے یہ تسلیم کی ہے کہ ٹیکس تو جملہ اقوام سے لیا جاتا تھا مگر نظام تعلیم جو قائم کیا گیا وہ صرف دیگر اقوام کے حسب حال تھا لیکن اُس سے بڑھکر یہ کیا گیا کہ صوبۂ بنگال کی اراضی کا جو چوتھائی رقبہ مذہبی اور تعلیمی کاموں کے لئے زمانۂ سابق سے وقف چلا آرہا تھا اُسے سرکار نے ۱۸۲۸ء میں ضبط کرلیا جس سے مسلمانوں کے تعلیمی زوال کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

حکام وقت نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ۱۸۰۶ء میں حاجی محمد محسن صاحب نے بنگال میں جو ایک جدید عظیم الشان وقف مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کیا تھا اُس کا بڑا حصہ کمپنی نے دیگر اقوام کی تعلیم پر صرف کیا۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب موصوف نے اور مسٹر جیمس اوکنیلی نے کیا ہے۔ یہ ثانی الذکر افسر مسلمان باغیوں کی تحقیقات پر مقرر ہوئے تھے۔ اُنھوں نے خود اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں کی ناراضی بے بنیاد نہ تھی اُن کی وفاداری کو عرصہ تک مشتبہ سمجھا گیا اور اُن کی طرف سے غفلت کی گئی۔ بالآخر ۱۸۷۰ء میں مسلمانوں کے متعلق حکومت کی پالسی بدلی اور قرار پایا کہ اُنھیں پڑھایا جائے۔

مگر جس غرض سے بالعموم تمام ملک کی اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا اُس کی غرض ڈاکٹر ہنٹر کے حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوگی:-

مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی نوعیت اور اس کا مقصد

"میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت کی تعلیم کا انتظام بسہولت بہت کم خرچ میں ہوسکتا ہے ...... امداد کے قواعد میں کچھ سہولت پیدا کی جائے جو بالکل کافی ثابت ہوگی۔ روپیہ کی اس قدر زیادہ ضرورت نہیں جس قدر کہ مسلمانوں کی خاص ضروریات مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مشرقی اضلاع میں جہاں کہ مذہب کا زور ہے وہاں میرے خیال میں گورنمنٹ کو مسلمان کاشتکاروں

تک پہنچنے کے لئے نیا نظام قائم کرنا پڑے گا۔ لیکن اس پر جو خرچ گورنمنٹ کرے گی اُس کا معاوضہ کافی مل جائے گا۔ ایسا نظام ایک زمانہ میں ہندوؤں کے لئے ضروری سمجھا گیا تھا ... لارڈ ہارڈنگ نے ایسے اضلاع میں تعلیم پھیلانے کے لئے جہاں کے لوگ خود تعلیم پھیلانا چاہتے تھے بہت سے اسکول قائم کئے تھے جن پر گورنمنٹ کو علاوہ فیس کے ۱۱۰۰ روپیہ سالانہ صرف کرنا پڑتا تھا ... اُس کا طریقہ یہ تھا کہ اول ایک عارضی اسکول کھول دیا جاتا تھا جس میں گاؤں کے بچوں کو تعلیم قریباً مفت ملتی تھی لیکن جب اُس کی قدر ہوتی تو فیس بڑھا دی جاتی اور جب وہ اسکول چل نکلتا تو اُس روپیہ سے دوسرے رقبہ میں اسکول کھول دیا جاتا۔ اس طریقہ سے مغربی بنگال کے جنگلوں کے اندرونی حصّوں میں تعلیم پھیلادی گئی۔

میرے خیال میں مشرقی اضلاع میں یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ جہاں کے لوگ مذہبی مجنون ہیں۔ ایسے اضلاع میں جو گورنمنٹ کے پشتینی بدخواہ اور ہمارے طریقۂ تعلیم کے مخالف ہیں۔ امداد کے قواعد کارآمد نہیں ہو سکتے۔ البتہ پچاس سستے مدرسے جن میں تھوڑی تنخواہ کے مسلمان مدرس رکھے جائیں اور جن کے اخراجات کا بڑا حصّہ گورنمنٹ ادا کرے۔ وہ ایک ہی نسل میں مشرقی بنگال کا عام پسند رنگ بدل دیں گے۔ ایسے مدارس شروع میں کم کامیاب ہوں گے مگر وہ رفتہ رفتہ نہ صرف مسلمان کاشتکاروں کے بچوں کو بلکہ مسلمان استادوں کو۔ جن کی آمدنی غیر یقینی ہے کھینچ لائیں گے۔ اُن کے لئے پانچ شلنگ فی ہفتہ کا زائد معاوضہ نعمت غیر مترقبہ ہوگا۔ اس طریقہ سے ہمیں اُس جماعت کو اپنا طرف دار بنالینا چاہیئے جو بالاستقلال شدّت کے ساتھ ہماری مخالف ہے۔"

مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر کرنے کی غرض

مسلمانوں کے تعلیمی مطالبات سے مدتوں قبل خود سرولیم ہنٹر نے یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر کئے جائیں۔ جنھیں مقرر کرنے کی غرض اُن کی کتاب کے حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوگی:

"مسلمانوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے ایک اسپشل (خاص) ڈپٹی انسپکٹر کی جو اُن کا ہم مذہب ہو ضرورت ہوگی اس کا پہلا فرض اُن مسلمان مدرسوں اور کالجوں کے متعلق رپورٹ کرنا ہوگا جو دیسیوں کی نگرانی میں ہیں ... ... مجھے اُمید نہیں کہ وہ انگریز افسران کے باقاعدہ معائنہ کو گوارا کریں گے لیکن ان میں سے بہت سے سرکاری امداد لینے کے لئے اپنے ہم مذہب ڈپٹی انسپکٹر کے معائنہ کی آسان شرط پر رضامند ہو جائیں گے۔ اس طرح پر ہم کو بنگال میں سب سے زیادہ باغی درس گاہوں کو اپنے ساتھ کر لینا چاہیئے۔ اگر وہ وفادار نہ بھی ہوں تو کم سے کم پُرامن تو ہوں"

خواندگی میں تنزل اب دیکھنا یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی تعلیم عامہ کا انتظام کرنے کا تہیہ کیا گیا تو سرکار کی تعلیمی پالسی کی وجہ سے ہندوستان کے خواندوں کی تعداد گر کر کس درجہ پر پہنچ چکی تھی۔

۱۸۷۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں مجھے خواندوں کی تعداد نہیں ملی البتہ ۱۸۸۱ء کی رپورٹ میں ملی ہے اور وہ صرف ۳½ فی صدی ہے یعنی یہ کہ اُس وقت ایک سو آدمیوں میں سے کل ۳½ یا ایک ہزار آدمیوں میں سے کل ۳۵ خواندے تھے مگر اب ہوا یہ کہ پُرانا نظام تعلیم تو ٹوٹ گیا اور زیادہ تر اس لئے ٹوٹا کہ قدیم مدارس کے پڑھے ہوئے لوگوں کو سرکار کی دس روپیہ کی نوکری بھی نہ مل سکتی تھی۔ اس لئے تمام تعلیم کا دارومدار سرکاری تعلیم پر رہ گیا اُس کے لئے سرکار نے کافی روپیہ نہیں دیا اور جو دیا اُس میں سے بعض صورتوں میں ۵۴ فی صدی تک افسران معائن اور مرکزی دفاتر پر خرچ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی ترقی کی رفتار برائے نام ہوئی۔ اس کا اندازہ گزشتہ چھ مردم شماری کی رپورٹوں سے ہوگا جن میں خواندوں کی تعداد درج ہے:-

۱۸۸۱ء میں	۳ء۵	۱۹۱۱ء میں	۵ء۹
۱۸۹۱ء میں	۴ء۶	۱۹۲۱ء میں	۷ء۳
۱۹۰۱ء میں	۵ء۳	۱۹۳۱ء میں	۸ء۵

اس طرح پچاس سال میں خواندوں کی تعداد بقدر پانچ فی صدی کے بڑھی
جب سنہ ۱۹۲۱ء میں جدید اصلاحات کا نفاذ ہوا اور صیغۂ تعلیم ہندوستانی وزرا کے ہاتھوں میں آیا اور لازمی تعلیم کا بھی کچھ عملدرآمد ہوا تو اُمید تھی کہ خواندوں کی تعداد کچھ بڑھے گی مگر افسوس کہ اس زمانہ میں بھی کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ اس لئے اگر پچھلی رفتار کا حساب لگایا جائے تو ہندوستان کو نوّے فی صدی خواندوں کی تعداد تک پہنچنے کے لئے ایک ہزار سال صرف ہوں گے۔

صوبۂ متحدہ میں خواندوں کی تعداد

خواندہ ہونے کے اعتبار سے جو حال تمام ہندوستان کا ہے اُس سے کہیں زیادہ بدتر اس صوبۂ متحدہ کا ہے۔ جہاں آپ تشریف رکھتے ہیں اُس میں خواندوں کی تعداد اور اُس کی رفتار حسب ذیل ہے:-

سنہ ۱۸۸۱ء میں	۳٫۰	سنہ ۱۹۱۱ء میں	۳٫۴
سنہ ۱۸۹۱ء میں	۳٫۲	سنہ ۱۹۲۱ء میں	۳٫۷
سنہ ۱۹۰۱ء میں	۳٫۱	سنہ ۱۹۳۱ء میں	۴٫۷

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچاس سال میں صوبۂ متحدہ میں خواندوں کی تعداد ۳ فی صدی سے بڑھ کر (۴٫۷) تک پہنچی۔ پس اگر ہم اپنا مطمح نظر متمدن ممالک کی طرح نوّے فی صدی رکھیں تو اُس درجہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں ڈھائی ہزار سال سے زیادہ لگیں گے۔

اس انتہائی تنزل کی حالت کو محسوس کر کے میں نے سنہ ۱۹۲۹ء میں صوبۂ متحدہ کی کونسل میں ایک تجویز پیش کی تھی جس پر ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اُس کمیٹی نے صوبہ کے بعض مقامات کا دورہ کر کے ایک مفصل اسکیم بنائی تھی اُس کی رو سے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ چھ اور گیارہ سال کے درمیان کی عمر کے کل لڑکے دس سال کے اندر اور اسی عمر کی کل لڑکیاں پندرہ سال کے اندر اسکولوں میں پہنچا دی جائیں مگر صوبہ کی مالی حالت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ تجویز معرض التوا میں پڑ گئی
ان معروضات سے میری غرض یہ ہے کہ جب کہ رعایا کا قدیم نظام تعلیم ٹوٹ چکا

تو کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ مثل دیگر ممالک کے حکومت خود وسیع پیمانہ پر اس کام کو کرے۔

پرائیوٹ کوشش

بے شک پرائیویٹ کوششوں سے اس بارہ میں کچھ نہ کچھ ہو سکتا ہے مگر تمام ملک کی ضروریات کے اعتبار سے وہ بمنزلہ نفی کے ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس ملک میں تعلیم بالغان کا چرچا سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے شروع ہوا ہے اور بوجہ اس کے کہ برادران وطن کو تعلیم کی طرف زیادہ توجہ ہے اور ان میں جوش ہے ان میں مذہبی اور سیاسی انجمنیں ہیں عوام الناس کا تعلیمی اور عام واقفیت کا معیار بلند کرنے میں پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔ مگر گزشتہ دو مردم شماریوں کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس بارہ میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ وہ اعداد حسب ذیل ہیں:-

	ہندو	مسلمان
سنہ ۱۹۲۱ء میں	۹ر۷	۶ر۴
سنہ ۱۹۳۱ء میں	۲ر۷	۴ر۵
	-۸ر	+۸ر

اس کے معنی یہ ہوئے کہ دس سال کے عرصہ میں ہندو خواندوں کی تعداد بقدر ۷ر فی صدی کے گھٹ گئی اور مسلمان خواندوں کی تعداد بقدر ۸ر فی صدی کے بڑھ گئی۔

خیر مردم شماری کے اعداد کچھ زیادہ قابل اعتبار بھی نہیں ہوتے۔ تاہم یہ بدیہی امر ہے کہ موجودہ حالات میں اس بارہ میں پرائیویٹ کوششوں کا کل تعداد پر بہت کم اثر پڑ سکتا ہے اور جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ صرف حکومت کے ذریعہ سے کیا جا سکتا ہے مگر ان دل فگار اعداد و شمار پیش کرنے سے میری ہرگز یہ غرض نہ تھی کہ اس بارہ میں پرائیویٹ طور پر کچھ نہ کیا جائے۔ صرف اس قدر غرض تھی کہ جو کچھ کیا جائے اس کا صحیح اندازہ رہے۔ اور جو تجاویز پیش کی جائیں ان میں ان امور کو پیش نظر رکھا جائے اور جو کام شروع کیا جائے اس میں غیر معمولی توقعات نہ قائم کی جائیں تاکہ بعد میں مایوسی نہ ہو۔

حضرات! اب میں چند امور پرائیویٹ کوششوں کی نسبت عرض کرنا چاہتا ہوں
اس بارہ میں ہمیں اپنی پچھلی تاریخ کا ورق لوٹنا پڑے گا جب کہ ہر خواندہ شخص اپنا مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھتا تھا کہ وہ اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ علاوہ اُن علما کے جنھوں نے تعلیم و تعلّم کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں۔ تمام بڑے اور چھوٹے عہدہ داروں کے پروگرام میں یہ داخل تھا کہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ طلبار کو پڑھاتے تھے اور چونکہ اُس زمانہ میں امراء اور غربا کی سوسائٹی ایک تھی اس لئے تعلیم بالغان کا سلسلہ بھی از خود جاری تھا۔ چنانچہ بڑے طبقہ کے اصحاب کے صحبت یافتہ لوگ بعض صورتوں میں حرف شناس بھی نہ ہوتے تھے مگر اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اچھے خاصے لکھے پڑھے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم بالغان شہروں اور دیہات تک محدود نہ تھی بلکہ علمار اور مشائخ دیہات میں جا کر عوام الناس کی معلومات میں اضافہ اور اُن کی ذہنیت میں بلندی پیدا کرتے تھے۔ اسی قسم کی روایات کی موجودگی سے اس زمانہ کے مسلمانوں کے دلوں میں یہ تجاویز پیدا ہوتی ہیں کہ مساجد کے ذریعہ مسلمانوں کی تنظیم کی جائے، اماموں کے ذریعے سے پوری عمر کے لوگوں کو پڑھوایا جائے۔ مگر ہر زمانہ کی تحریکات جداگانہ نوعیت رکھتی ہیں اور اس وقت خالص مذہبی جذبہ کے تحت میں یہ کام ہونے مشکل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ برادرانِ وطن میں اس وقت مذہبی جذبہ کے انحطاط کے ساتھ سیاسی جذبہ پیدا ہو کر رو بہ ترقی ہے اور اب وہ اس نئے جذبہ کے تحت میں اپنے جاہل بھائیوں کو اُبھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

غنیمت ہے کہ مذہبی جذبہ کے ساتھ سیاسی اور قومی خدمت کرنے کا جذبہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے اور اب عین وقت ہے کہ اُس سے فائدہ اُٹھایا جائے اور مسلمانوں میں پھر وہی کیفیت پیدا کر دی جائے جو کسی زمانہ میں تھی۔

اُس کے لئے جناب سکرٹری صاحب نے میرے مشورہ سے کچھ تجاویز مرتب کی ہیں جو وہ آپ کی خدمت میں پیش کریں گے اس لئے میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں -

خطبۂ صدارت

شعبۂ اُردو کانفرنس

مولوی عبدالحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقی اُردو
صدر اردو کانفرنس علی گڑھ

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا، وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر شعبہ کا علیحدہ صدر اور ایک مستقل سکرٹری تھا۔

منجملہ ان شعبوں کے ایک شعبہ اُردو کانفرنس بھی تھا جس کے صدر مولوی عبدالحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن تھے، اور سکرٹری مولوی رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے پروفیسر مسلم یونیورسٹی۔

اس شعبہ کا اجلاس ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۸ بجے شب اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا، اس موقع پر مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے بحیثیت صدر شعبہ جو خطبہ پڑھا وہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خُطبۂ صدارت

از

مولوی عبدالحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقی اُردو، صدر اُردو کانفرنس علی گڑھ

گری زون سوستان کا ایک پرگنہ ہے اور پہاڑی علاقہ ہے، اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں قدیم سے ایک روایت مشہور چلی آرہی ہے کہ خلاقِ عالم نے فرشتہ کلمائیل کو بیجوں بھرے تھیلے دیے اور فرمایا کہ جاؤ، تم دنیا کا ایک چکر لگاؤ اور زبانوں کے یہ بیج لوگوں کے سروں میں بوتے چلے جاؤ۔ فرشتے نے ارشاد خداوندی کی تعمیل کی اور یہ بیج بنی نوع انسان کے دماغوں میں جم گئے اور فوراً اُگنے شروع ہوئے اور زبانیں چشمے کی طرح اُبلنے لگیں۔ جب فرشتہ کلمائیل اپنے تھیلے خالی کر چکا اور خلاق عالم کے پاس واپس آنے کو ہوا تو یہ دیکھ کر اُسے سخت ندامت اور پریشانی ہوئی کہ گری زون کا علاقہ چھٹ گیا ہے۔ اس نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں اس فرو گزاشت کے متعلق عرض کیا۔ خدا نے مختلف تھیلوں کے ملے جلے بیج جو بچ رہے تھے اسے دیے اور کہا کہ جاؤ، یہ وہاں جا کر بو آؤ۔ یہی وجہ ہے کہ

اس پہاڑی آبادی میں طرح طرح کی زبانیں اور بولیاں پائی جاتی ہیں۔

یہ نقل بہ نسبت گری زوں کے ہندوستان پر زیادہ صادق آتی ہے جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں جن کی تعداد بیسیوں نہیں سیکڑوں تک پہنچ گئی ہے لیکن اس ہجوم میں ایک زبان ایسی بھی نظر آتی ہے جو ملک کے اکثر علاقوں میں بولی جاتی ہے اور تقریباً ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان ہندوستانی یا اُردو ہے جس کا ادب نظم و نثر میں نویں صدی ہجری سے مسلسل موجود ہے۔ یہ ہمارا ہی دعوئ نہیں بلکہ اس کی شہادت غیروں نے بھی دی ہے اور یہ شہادتیں یورپی سیاحوں کی تحریروں میں سترہویں صدی کی ابتدا سے بعد تک برابر ملتی ہیں! ایک موقع پر کسی خاص معاملہ میں ابی سینیا کے سفیر خوجہ (Mozaa [illegible]) سے چند استفسارات کیے گئے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ " فلاں شخص نے آپ کی حضوری میں کس زبان میں گفتگو کی"۔ وہ جواب دیتے ہیں " ہندوستانی زبان میں۔ جس کی ترجمانی دیر اکسلنسیز دی ہائی گورنمنٹ آف بٹاویا کے سکرٹری نے کی۔ یہ واقعہ ۱۶۹۷ء کا ہے۔ اسی زمانہ کا ایک سیاح لکھتا ہے کہ " دربار کی زبان تو فارسی ہے مگر عام بول چال کی زبان 'اندوستان' ہے" (فرائیر)۔

یہ اگلی باتیں ہیں انھیں جانے دیجے۔ کمپنی کے زمانے کو لیجیے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا کاروبار یہاں جمایا اور تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھایا تو تجارت اور سیاست دونوں اغراض کی خاطر تازہ ولایت نو کار انگریز ملازموں کی تعلیم کے لیے ملک کی ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا جو اپنی عام مقبولیت اور وسعت کی وجہ سے سب سے زیادہ کارآمد تھی، یہ زبان ہندوستانی یعنی اُردو تھی۔ اس کے لیے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا جو فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قابل زباں داں ہندی ملازم رکھے گئے جو نوجوان نوواردوں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم بھی دیتے تھے اور کتابیں بھی تالیف اور ترجمہ کرتے تھے۔ اس کالج کے معلم اوّل ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو اُردو کے محسن اور اس کے شیدائیوں میں سے تھے اس زبان کو [illegible] of India

Grand popular speech کہتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ وہ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ نہایت کارآمد اور عام زبان ہے جس پر ہندوستان فخر کرسکتا ہے۔" وہ اپنی اسی کتاب برٹش انڈیا مونی ٹر میں لکھتے ہیں کہ "چونکہ ہندوستانی ہندوستان کی سب سے زیادہ عام زبان ہے اور جو ہمیں شب و روز اپنے دیسی افسروں، مدرسوں، ملازموں اور دیگر متعلقین سے گفتگو کرنے میں استعمال کرنی پڑتی ہے اس لئے نحوی اصول کے ساتھ اسے جس قدر جلد سیکھا جائے اسی قدر بہتر ہے۔"

اس زبان کی تعلیم کے متعلق گورنمنٹ کے احکام نقل کرنے کے بعد وہ ان برٹش افسروں اور دیگر اصحاب کے نام ایک پیام بھیجتا ہے جو ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پیام یہ ہے:۔

"جب سے متذکرۂ بالا احکام نافذ ہوئے ہیں، بنگال گورنمنٹ نے بنگال، مدراس اور بمبئی کے ملکی اور فوجی علاقوں کے لیے مشرقی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا ہے۔ ان سب میں ہندوستانی بجا طور پر مقدم اور اہم خیال کی گئی ہے اور اس لیے تمام رائٹروں اور کیڈٹوں کو ہندوستان پہنچنے پر سکھائی جاتی ہے۔

ہندوستانی زبان کا علم برٹش انڈیا میں نہ صرف ہر ایک ایسے اجنبی کے لئے لازم ولابد ہے جو عام طور پر اہل ملک سے ذاتی تعلقات رکھتا ہے بلکہ اس سے فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی تحصیل کا رستہ بھی کھل جاتا ہے جہاں وہ ہندوستانی کے ذریعہ سے جو ہندوستان کے باشندوں اور خصوصاً منشیوں یا دیسی سوداگروں کی دیسی زبان ہے، ان مقامی قدیم زبانوں کو بہت جلد سیکھ لیتا ہے۔

بحری اور بری فوج میں نیز ہندوستان کے خانگی معاملات میں کسی زبان کا ایسا عام رواج نہیں جیسا ہندوستانی کا اور کیڈٹوں کو جو فوجی اکیڈمیوں میں لِسے پڑھتے ہیں یا فوجی تعلیم حاصل کرتے ہیں کسی اور زبان کی ضرورت نہیں پڑتی یہ اکیڈمیاں

British India monitor ۵ا
Preface x CIV
do. xx IV ۵ٹ

بنگال، مدراس اور بمبئی میں قائم کی گئی ہیں۔

جس طرح یورپ میں ایک تعلیم یافتہ شخص کے لیے بعض جدید اور قدیم زبانوں کا علم مفید اور موجب زینت سمجھا جاتا ہے اسی طرح ہندوستان میں سنسکرت، فارسی، عربی، وغیرہ کا علم بھی وہی درجہ رکھتا ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں ہر شخص کے لیے ہندوستانی کا جاننا ایسا ہی ناگزیر ہے جیسا کہ انگلستان والوں کے لئے انگریزی کا جاننا۔ اور اسی لیے ان حضرات کا جو ایسٹ انڈیز کو آنا چاہتے ہیں سب سے ضروری اور بڑا وصف یہی ہونا چاہیے کیونکہ دیر سویر اُن پر صاف کھُل جائے گا کہ ہندوستانی کے مقابلے میں یہ علمی زبانیں دوسرے درجے پر ہیں اور بعد میں یہ زبانیں اس ملک میں زیادہ آسانی اور کم خرچ میں سیکھی جا سکتی ہیں۔

اگر یہ دلیل انگلستان و بیرون انگلستان کے چند سالہ تجربہ کی بنا پر معروف مسلّم واقعات پر مبنی ہے تو پبلک بجا طور پر یہ اُمید رکھتی ہے کہ "ہرفورڈ" اور "مارلو" کے سول اور ملٹری کالجوں کے شعبوں میں ہندوستانی زبان کی تعلیم ان طلبہ کے لیے جو ہندوستان آنا چاہتے ہیں، سب سے مقدم خیال کی جائے گی۔ کیونکہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے انگلستان کے جج اور سول اور ملٹری کے عہدہ دار، خود وہ کیسے ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہوں وہ ہمارے ملک میں اپنے عہدوں کے بالکل نااہل ثابت ہوں گے اگر وہ ہماری مادری زبان نہیں جانتے۔

اسی طرح ہندوستان میں ہندوستانی کا وہی درجہ ہے جو انگریزی کا برطانیہ میں یا ترکی کا اُس کی سلطنت میں اور یہ ایک ایسی بات ہے جو راہ چلتا بھی سمجھ سکتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مدراس کے ایک انگریز افسر کا خط بھی نقل کیا ہے جس میں سے حسبِ ذیل اقتباس پڑھنے کے قابل ہے۔ خط ۱۹ جون ۱۸۰۲ء کا لکھا ہوا ہے:۔

"ہندوستانی بولی کے متعلق میرا کچھ کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ اس کی وسعت اور قوت اُن تمام اشخاص پر کافی طور سے آشکارا ہے جن کا تعلق ہندوستان کے کاروبار یا ادب سے ہے، میری رائے میں صرف اس بولی کا معقول علم اس گورنمنٹ کے علاقوں کے ہر حصے کے لئے بالکل کافی ہے .... نواب آف ارکاٹ کے تمام علاقوں اور ٹیپو سلطان کی مملکت بالاگھاٹ میں ہندوستانی سے وہ سب اشخاص واقف ہیں جو سرکاری دفاتر میں امور ہیں نیز عام لوگوں کی بڑی تعداد اس زبان کو جانتی ہے"

ڈاکٹر صاحب اپنی ایک اور تصنیف "ایسٹ انڈیا گائڈ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف اضلاع اور صوبوں میں خاص خاص بولیاں بولی جاتی ہیں۔ لیکن ہم جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اگر فرداً فرداً دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی بھی عام طور پر ایسی مفید اور ضروری نہیں جیسی ہندوستانی ......

اب ہم اس دعوے کی تائید میں چند دلائل پیش کرتے ہیں جو بلا شبہ اس کی صداقت کا تشفی بخش اور دلنشیں ثبوت ہوں گی۔

ہندوستان کے وسیع ملک میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان پایا جائے گا جو مقامی اور ذاتی حالات یعنی خاندانی و تعلیمی وغیرہ کے لحاظ سے کم و بیش شستگی اور خوبی سے ہندوستانی زبان نہیں بولتا یا نہیں سمجھتا۔ نیز ہر شریف ہندو یا وہ جس کا ذرا سا بھی تعلق کسی مسلمان حکومت یا برٹش گورنمنٹ سے ہے اپنے منصب اور حیثیت کے لحاظ سے ضرور اس زبان سے کچھ نہ کچھ واقف ہے۔

علاوہ اس کے یہ ایک مشترک ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہل ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے اکثر باشندے جو اس ملک میں بس گئے ہیں اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں۔ اس بیان کی صداقت کی تائید

ہیں ہم خود ایک شہادت ہیں اور ہماری طرح پرتگالی، ولندیزی (ڈچ)،
فرانسیسی، ڈین، عرب، ترک، یونانی (گریک) ارمنی، گرجی، ایرانی،
مغل اور چینی بھی ہیں جو اکثر باہم ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں، کیونکہ
ان کی اپنی زبانوں کے مقابلے میں ہندوستان کی یہ لنگوا فرینکا زیادہ
سہولت بخش ہے۔

ہندوستان کی تمام فوجوں میں یہ زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اگرچہ
اِن افواج کے اکثر افراد اپنی اپنی حکومتوں، علاقوں، صوبوں اور اضلاع
کی بولیوں کو مادری زبان کی حیثیت سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

تقریباً کیپ کامورن سے لے کر کابل تک سارا ملک جو طول میں دو ہزار
میل اور عرض میں ۱۴۰۰ میل ہے۔ اس میں جہاں جہاں گنگا بہتی ہے شاید ہی
کسی بڑے گاؤں، قصبہ یا شہر میں جسے مسلمانوں نے فتح کیا یا جہاں مسلمان
آباد ہیں کوئی ایسا شخص ملے گا جو اچھی خاصی طرح ہندوستانی نہ جانتا ہو اور
گنگا سے بھی بہت پرے، نیز مشرقی جزائر کے سواحل پر بھی یہ زبان رائج ہے
اور اس قدر معروف ہے کہ بہت آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔

اگرچہ ہندوستانی میں نثر کی بہت سی کتابیں مثلاً تاریخی، یا علمی تالیفات
نہیں ہیں۔ تاہم بہت سے شستہ قصّے اور دل کش نظمیں موجود ہیں۔ عام طور پر
خانگی، تجارتی اور فوجی اور نہایت اہم سیاسی معاملات کے متعلق مراسلت
اسی زبان میں کی جاتی ہے۔ اور اس موقع پر ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ
دیسی علماء کا درس اور مضامین ادب پر ان کی تمام بحثیں اور دلائل اسی زبان
میں کی جاتی ہیں اور ہر حالت میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی ہندوستان کا کوئی
باشندہ اپنے کسی خیال یا مضمون کو کسی دوسری زبان میں لکھنا یا ترجمہ کرنا چاہتا ہے
تو قبل اس کے کہ وہ اسے فارسی مکتوب کے طور پر لکھے یا کوئی سیاسی تحریر قلمبند
کرے وہ ہمیشہ اپنے خیالات کو ہندوستانی میں ترتیب دیتا ہے اور اپنا مفہوم

اسی زبان میں ادا کرتا ہے۔

اگر یہ تمام بیانات اور دلائل صداقت پر مبنی ہیں تو ان کی قوّت کو کون چیز کمزور کر سکتی ہے، اوپر کے صغریٰ کبریٰ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سوداگر، سیّاح، وکیل، مُلّا یا پادری، فلسفی، طبیب، غرض ہر شخص کے لیے جو ہندوستان میں کسی قسم کا بھی کوئی کام کر رہا ہے یا یہاں امن و خوشی سے رہنا چاہتا ہے ہندوستانی زبان بہ نسبت کسی دوسری زبان کے عموماً نہایت ضروری اور مفید ہے اور اس اعتبار سے سب سے مقدم اسی کا سیکھنا ہے اور اس کے بعد بوجہ ان اعلیٰ فوائد کے جو اسے باقی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بدرجۂ اتم حاصل ہیں یہ نہایت درجہ قابل قدر اور لائق مطالبہ ہے۔"

کول بروک جو بڑے عالم گزرے ہیں، ایشیاٹک ری سرچز کی ساتویں جلد میں لکھتے ہیں کہ:-

"یہ شستہ زبان جو ہندوستان اور دکن کے ہر حصّے میں بولی جاتی ہے یا جو تعلیم یافتہ دیسیوں نیز ہندوستان کے بہت سے صوبوں کے ناخواندہ لوگوں میں باہمی گفتگو کا مشترک ذریعہ ہے اور جسے تقریباً ہر جگہ نیز ہر گاؤں کے اکثر باشندے سمجھتے ہیں۔"

ڈاکٹر گلکرسٹ نے اپنے ایک شاگرد رشید کا خط نقل کیا ہے جو بہت دل چسپ اور حقیقت افروز ہے۔ اس کے کاتب مشہور مسٹر مٹکاف ہیں جو اس وقت دلّی کے اسسٹنٹ رزیڈنٹ تھے اور بعد میں رزیڈنٹ گیا دِلّی کے آقا ہو گئے تھے۔ یہ خط ۲۹ راگست ۱۸۰۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں اُردو کی کیا حیثیت اور وقعت تھی وہ لکھتے ہیں:-

"میرا خیال ہے کہ میں آپ کو اس معاملے کے بارے میں قابل اطمینان اطلاع مہیا کر سکتا ہوں جس کے متعلق آپ کو قدرتی طور پر تشویش ہے۔ ہندوستان کے ہر حصّے میں جہاں جہاں میں ملازمت کے سلسلے میں رہا یعنی

کلکتے سے لاہور کے قرب و جوار تک اور کوہستان کمائیوں سے زبدا تک افغانوں راجپوتوں، جاٹوں، سکھوں اور مختلف اقوام میں جو ان ممالک میں آباد ہیں جن میں میں نے سفر کیا ہے، میں نے اس زبان کا عام رواج دیکھا جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی، یوں کہنے کو بہت سی بولیاں اور لہجے ہیں۔ اپنی بات سمجھانے یا دوسرے کی سمجھنے کے لئے اکثر بہت صبر کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارے کان ہمیشہ ان آوازوں سے آشنا نہیں ہوتے جو ہم سنتے ہیں، اول اول دیسی لوگ ہمارے لہجے اور ڈھنگ کو بغیر بار بار دہرائے نہیں سمجھتے۔ یہ دقت اکثر مقامات پر واقع ہوتی ہے۔ لیکن میں ذاتی تجربہ نیز اُن اطلاعات کی بنا پر جو مجھے دوسروں سے حاصل ہوئی ہیں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں کیپ کامورن سے کشمیر تک اور آوا سے دریائے سندھ کے دہانے تک پیدل چلا جاؤں تو مجھے ہر جگہ ایسے لوگ ملیں گے جو ہندوستانی بول سکتے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ منشا نہیں کہ میں ایسے لوگ مطلق نہ پاؤں گا جو یہ زبان نہیں بول سکتے، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس وسیع خطے میں جس کا میں نے ذکر کیا ہے مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں بلکہ ایسا نہ ہو تو تعجب ہے لیکن ہندوستانی ہی وہ زبان ہے جو عام طور پر کار آمد ہے اور میری رائے میں اسے وہ عام وسعت حاصل ہے جو دنیا کی کسی زبان کو نصیب نہیں۔ میں ابھی اس زبان میں کچا ہوں لیکن جس قدر میرا جہل زیادہ ہے اسی قدر میری شہادت قوی ہے اور جہاں تک میری شہادت کا تعلق ہے ہندوستانی کا بول بالا رہے گا۔ میرے خیال میں دنیا خاص طور پر آپ کی رہین منت ہے اور اسے آپ کی اُن پُرجوش اور مخلصانہ کوششوں کے لئے آپ کا شکرگزار ہونا چاہیئے جو آپ نے مشرقی ادب کی اس نہایت مفید اور نہایت اہم شاخ کی اشاعت و ترقی میں فرمائی ہیں ؎

زباں دانِ اُردو ہے ایسا کہ آج

ہے قانونِ ہندی کو اس سے رواج"

میں نے جو کسی قدر طویل اقتباسات پڑھ کر سنائے ہیں اس سے میرا منشا یہ جتانا تھا

کہ اردو زبان خاص کر اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں اپنی مقبولیت اور عالمگیری میں سب پر سبقت لے گئی تھی اور یہ رفتار اس کی برابر جاری رہی چنانچہ موسیو دیوپاں نے جو انسٹی ٹیوٹ کے رکن اور سینٹ کے ممبر اور فاضل شخص تھے اپنی کتاب "اقوام کی پیدائش قوت" میں ایک باب ہندوستانیوں کے متعلق لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ :

"برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۲۸ کروڑ ، ۴۰ لاکھ ہے۔ آپ کو معلوم رہنا چاہیئے کہ ان میں تقریباً ۲۰ کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتہ کا کام دیتی ہے وہ اُردو زبان ہے یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبہ کی سرزمین میں بولی جاتی ہے۔"[1]

گارسان دتاسی جو اُردو زبان کے پروفیسر اور عالم اور اُس کے بڑے حامی تھے اور جنھوں نے اپنے زمانہ میں اُردو کی یادگار خدمت کی اور ایسی عمدہ کتابیں لکھیں اور زبان کے متعلق ایسی قابل قدر معلومات مہیا کیں جو کوئی اہل زبان بھی نہ کرسکا ۱۸۶۵ء کے خطبہ میں کہتے ہیں :-

بہرنہج لوگوں کا خیال ہندوستانی کی نسبت کچھ ہی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ دن بدن جو اس کی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جاسکتی ہے اس مسئلے کی نسبت کپتان ایچ، مور نے جو مرکزی حکومت میں ترجمان کی خدمت پر فائز ہیں اپنی رائے سے مجھے ان الفاظ میں مطلع کیا ہے : بلا شبہ کچھ عرصے کے بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرے گی، اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو اندرون ملک میں ہزارہا میل کی مسافت میں پھیل گئی ہے، ہندوستان اور وسط

---

[1] خطبات گارسان دتاسی ص ۳۶۵

ایشیا کے لوگوں کو اور بھی ملنے جلنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی ساخت میں ہندی، فارسی، عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد پورا کرے۔ میرے خیال میں ہندوستان کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ہیں اسی قدر ہندوستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں۔[1]"

یہ وہ زمانہ ہے کہ اُردو مقبول خاص و عام تھی اور اس کی مقبولیت کا ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۳۵ء کے بعد جب فارسی کے بجائے اُردو دفتری زبان قرار دی گئی تو کوئی آواز اس کے خلاف سننے میں نہیں آئی اور کسی نے یہ نہ کہا کہ اُردو نہیں فلاں زبان ہونی چاہیئے۔ اس کی یہ متفقہ مقبولیت ایک مدت تک برابر جاری رہی، چنانچہ گارساں دتاسی، بمبئی گزٹ مورخہ ۲۶ فروری ۱۸۶۱ء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"بنگال، بہار اور اُڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی جس میں یہ درخواست کی کہ جدید ہائی کورٹ میں کارروائی اُردو زبان میں ہونی چاہیئے۔ اس زمانے میں بمبئی کی نئی نئی یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، ۱۸۶۰ء کے ڈگری کے امتحان میں اُردو زبان بھی تھی اور اس کے نصاب میں "باغ و بہار" اخلاق ہندی، مثنوی میر حسن اور دیوان ناسخ شریک تھے۔[2]"

یہ وہ زمانہ تھا کہ ان صوبوں کے ہندو تعلیم یافتہ اور اہل قلم جہاں کی زبان اُردو نہ تھی نیز انگریز مدبر اور حاکم تک عام جلسوں میں اُردو میں تقریریں کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ کشمیر کی گدی نشینی کے موقع پر جموں میں جو دربار ہوا اس میں مسٹر ڈیوس جو اس موقع پر گورنمنٹ ہند کے نمائندہ تھے جب نئے راجا کے سینے پر تمغہ

---

1. خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۴۵۸ ۱۸۶۵ء
2. خطبات گارساں دتاسی ص ۳۲۴

لگا چکے تو مہاراجہ نے ان کی تقریر کا جواب اُردو میں دیا۔

سر جے بی گرانٹ لفٹنٹ گورنر بنگال جب یورپ واپس جارہے تھے تو اہل کلکتہ نے ۱۶ اپریل ۱۸۶۱ء کو اُن کے اعزاز میں ایک عام جلسہ منعقد کیا، اس جلسے کے صدر راجا رادھا کانت دیو بہادر تھے، انھوں نے اس موقع پر اُردو میں تقریر کی، ان کے بعد راجا کالی کشن بہادر نے جو مشہور مصنف گزرے ہیں تقریر کی اور وہ بھی اُردو میں تھی۔ نیز ایک جلسے میں سر جان گرانٹ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنے کی تحریک ہوئی جو متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ اس جلسے میں راجا اپروا کرشن نے اُردو میں تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ کلکتے میں سر جان گرانٹ کا بُت نصب کیا جائے۔ اسی طرح کلکتے کے ایک اور جلسے میں جو اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں سے اظہار ہمدردی کیا جائے، مختلف مقرروں نے ہندوستانی میں تقریریں کیں اور راجہ نرائن سنگھ نے اس جلسے میں تجاویز کی تائید اُردو میں کی[1]۔ شاہزادہ ویلز کی شادی کے موقع پر ہندوستان میں ہر جگہ جلسے منعقد ہوئے اور ان میں ہندوستانی زبان میں تقریریں کی گئیں۔ فروری ۱۸۶۲ء میں جب سر ہنری منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب ریاست کپور تھلہ تشریف لے گئے تو اس موقع پر صاحب موصوف نے مشن اسکول کے طلبہ کے سامنے ہندوستانی میں تقریر کی۔ جنوری ۱۸۶۴ء میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا جس میں مختلف ہندوستانی راجا، امرا اور سرکاری عہدہ دار شریک تھے لفٹنٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں اُردو میں جلسہ کو خطاب کیا۔

جب سر جان لارنس وائسرائے کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے تو انھوں نے ایک بڑا شان دار دربار آگرے میں منعقد کیا۔ جب وائسرائے تخت پر بیٹھنے کے لئے تشریف فرما ہوئے تو توپوں کی سلامی دی گئی اور سر ولیم میور نے شاہی فرمان کا

---

[1] خطبات دتاسی ص ۳۰۱

ترجمہ پڑھا اور خود وائسرائے نے حاضرین کے روبرو ہندوستانی میں تقریر کی۔ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن مراد آباد میں لفٹنٹ گورنر نے اُردو میں تقریر کی نیز مدرسہ مراد آباد کے افتتاح کے موقع پر بھی صاحب موصوف نے اُردو ہی میں جلسے سے خطاب کیا۔ مہاراجا بنارس نے ۱۸۶۸ء میں چیمبرز انسائکلوپیڈیا کے اُردو ترجمہ کے لئے دس ہزار منظور کئے۔ بشرطیکہ حکومت بھی دس ہزار دے۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ اُردو کی مقبولیت کے کیا اسباب ہیں، دوسرے ہندی اُردو کے اختلاف کا مسئلہ کیوں کر پیدا ہوا۔

میں پہلے دوسرے سوال کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بعض اصحاب کا جو یہ خیال ہے کہ سر سید احمد خاں نے نیشنل کانگرس سے مخالفت کر کے ہندی اُردو کا اختلاف پیدا کیا، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ فساد سب سے اوّل ۱۸۶۷ء میں بنارس سے اُٹھا، جہاں "بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اُردو زبان اور فارسی خط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔"

"ہندوؤں کی اس قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی، اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورۂ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں۔"[1] اس کے بعد یہ جھگڑا مختلف صورتوں میں طرح طرح سے اب تک چلا آرہا ہے جس کی تاریخ اور تفصیل کا یہ موقع نہیں، میں یہاں صرف مختصر طور پر اس کے اصل وجوہ پر غور کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے زمانہ میں آج کل کی طرح زبان سیاست کے دنگل میں نہیں اُترتی تھی

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۱۴۰

لوگ جس زبان میں زیادہ سہولت دیکھتے یا جس زبان میں اشاعت کا زیادہ سامان پاتے اس میں لکھتے تھے اور اکثر اہل قلم اپنی زبان ترک کر دیتے اور غیر زبان میں لکھنا پسند کرتے تھے۔ ایک زمانے میں لاطینی سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی اور بعض جرمن اور انگریز مصنفین لاطینی میں تالیف اور تصنیف کرتے تھے، اس میں کسی حکومت کا دباؤ نہ تھا بلکہ اپنے شوق سے کرتے تھے اور انھیں کبھی اس کا گمان تک نہ ہوتا تھا کہ ایسا کرنا قومیت یا وطنیت کے حق میں غداری ہے۔ فریڈرک اعظم اگرچہ کٹر جرمن تھا لیکن فرانسیسی بولنے اور لکھنے کو ترجیح دیتا تھا اور فرانسیسی لکھتے یا بولتے وقت اس کے خیال میں بھی کبھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس کے جذبۂ قومیت کے منافی ہے۔ یا ہمارے ملک کی مثال لیجئے۔ جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا تو ہمارے ہم وطن تعلیم یافتہ اکثر انگریزی میں بات چیت اور خط وکتابت کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں اگرچہ پہلا سا خبط اب نہیں رہا۔ اور جنھیں توفیق ہوتی انگریزی میں تصنیف تالیف بھی کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کا کوئی قانون ایسا نہیں کہ سوائے انگریزی کے کسی دیسی یا دوسری زبان میں تالیف نہ کی جائے۔ لوگ یہ سب کچھ اپنے شوق سے کرتے ہیں بعینہٖ یہی حال مغلوں کی حکومت میں تھا۔ جب کہ یہاں فارسی کا رواج ہوا۔ مغلوں کی حکومت میں ہندوستان کی کایا بدل گئی۔ وہ اس ملک میں اپنے ساتھ نئے آئین اور نئے اصول حکومت اور نیا مذہب لائے، اُنھوں نے نئی تنظیم اور نئی حکمت کو رواج دیا اور نئے تمدن اور نئی تہذیب اور نئی معاشرت کا دور شروع ہوا، نئے آداب مجلس، نئے رسم و رواج اور نئے ذوق نے رواج پایا، ان کے ساتھ طرح طرح کے کپڑے، قالین اور فرش فروش سامان آسائش و آرائش، نئے آلات جنگ، نئے پھول اور پھل، اور نئے قسم کے کھانے، نئی قسم کی صناعی، نئی قسم کی اصطلاحات اور الفاظ یہاں آئے اور رائج ہوئے۔ اُنھوں نے یہاں کے حالات میں ایک عجیب تغیر پیدا کر دیا اور سارے ماحول میں ایک نیا رنگ روپ نظر آنے لگا۔ اس جدید ذوق، اس جدید تہذیب اور جدید خیالات کے ادا کرنے

کے لیے جو اس ماحول میں ساری تھے سوائے فارسی کے کوئی دوسری زبان نہ تھی۔ ایک تو اس لئے کہ اس زبان میں شیرینی، لچک، وسعت تھی، الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ موجود تھا اور بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے یہاں کے سانچے تیار تھے۔ دوسرے اس میں لکھنے سے تحریر اہل بصیرت اور اصحاب ذوق کی نظر سے گزرتی تھی اور ہندوستان ہی میں نہیں اس سے باہر بھی پہنچتی تھی اور تحسین حاصل کرتی تھی۔ تیسرے رواج کی پابندی اور ماحول کا اثر خود بخود اس طرف کھینچ لاتا تھا۔ چوتھے اس میں کسی قدر مشیخت کا بھی شائبہ تھا۔ اس میں ہندو مسلمان سب برابر تھے، دونوں کی تحریریں پڑھئے ذرہ برابر فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ اس لیے نہیں تھا کہ مغلوں نے فارسی سیکھنے کے لیے جبر کر رکھا تھا ان کے عہد میں علم اور زبان کی عام آزادی تھی، بلکہ انھوں نے سنسکرت اور دوسری دیسی زبانوں کی بڑی سرپرستی کی جس کی وجہ سے انہیں بہت فروغ ہوا۔ چنانچہ ان کے عہد میں سنسکرت کے اعلیٰ مصنف اور سنسکرت اور ہندی کے بہت سے نامور شاعر ہوئے ہیں۔ فارسی کی طرف یہ عام رجحان جدید حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں زبان کے معاملے میں عام رواداری کا برتاؤ تھا اور لوگ غیر زبان بولنے اور غیر زبان لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔

لیکن یہ آزادی اور رواداری دنیا میں زیادہ مدت تک نہیں رہی۔ ایک زمانہ آیا جب کہ مذہب اور عقیدے کی طرح زبان بھی سیاسی لپیٹ میں آگئی۔ جرمنوں نے فرانسیسیوں کی نفرت کی وجہ سے فرانسیسی اور دوسری زبانوں کے لفظ اپنی زبان سے اسی طرح خارج کر دینے شروع کر دیئے جیسے آج وہ یہودیوں کو اپنے ملک سے جلاوطن کر رہے ہیں۔ اسی طرح سیواجی کے زمانہ میں مرہٹی زبان سے عربی فارسی کے نکال دینے کی کوشش کی گئی۔ آئرلینڈ میں محض انگریزی کی مخالفت میں آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جد وجہد جاری ہے۔ ترکوں نے اپنی زبان سے غیر زبانوں کے لفظ نکالنا شروع کر دیئے ہیں۔ ایران میں پہلے بھی ایک کوشش ہوئی لیکن ناکام رہی اب وہ پھر ترکوں کی طرح غیر زبانوں کے الفاظ نکال دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ زبان کے لئے اب لڑائیاں

چھڑ جاتی ہیں، دوسری زبانوں کو مٹانے اور فنا کرنے کے لئے جابرانہ احکام اور آئین نافذ کئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شہروں اور مقاموں تک کے نام بدل دیئے جاتے ہیں۔

زبان اور قومیت اب ایک دوسرے کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں اور جب اس کے ساتھ مذہب بھی آشریک ہوتا ہے تو یہ بادۂ تلخ دوآتشہ ہو جاتی ہے۔

یہی صورت ہندوستان میں پیش آئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کمپنی بہادر برخاست ہوئی۔ انگریزی راج آیا، حالات نے پلٹا کھایا، جدید قانون اور آئین نافذ ہوئے، جو آگے تھے پیچھے اور جو پیچھے تھے آگے ہو گئے۔ چند ہی سال بعد قومیت کا خیال جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا اڑتا ہوا یہاں بھی پہنچا۔ ریل اور تار کی حیرت انگیز اختراعوں، کالجوں کی تعلیم، آزادی اور حب وطن کی تقریروں اور تحریروں، انگریزی انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبہ کو اور اکسایا خاص کر ہندو اس سے زیادہ متاثر ہوئے، وہ اس نئے دور کو اپنے حق میں آزادی کا دور سمجھے، اس کے ساتھ ہی اپنی شاندار قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی دلوں میں نیا جوش پیدا کیا جسے میکس مولر نے، بہارا اور جس سے بعد میں اینی بزانٹ نے خوب کام لیا۔ لیکن سب سے زیادہ مستحکم طور پر یہ خیال سوامی دیانند سرسوتی نے دلوں میں جمایا، گروکل قائم ہوئے جس میں سنسکرت پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازم تھا، ویدک زمانے کی معاشرت کی نقل کی جانے لگی، ننگے پاؤں پھرنا، ایک بے سلی چادر اوڑھنا، لپیٹنا، جنگلوں میں رہنا، زیر سما سونا۔ وغیرہ وغیرہ قومی شعار قرار پایا۔ اسی قومیت کے جذبے، مقدس قدامت اور ماضی کے غرور، نام نہاد نئی آزادی اور نئی تعلیم نے اس میں نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ طرح طرح سے اپنی نئی حیثیت اور انفرادیت جتانے لگے اور جس طرح ایک بے وقوف عورت نے اپنی خوبصورت انگوٹھی دکھانے کی خاطر گھر کو آگ لگا دی تھی انھوں نے بھی بنے بنائے گھر کو بگاڑنا شروع کیا۔ سب سے پہلے نزلہ اردو زبان پر گرا۔ اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ اسلامی عہد کی پیداوار تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں اس نے جنم لیا۔ لیکن صرف مسلمان اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہ

درحقیقت اس زمانے کے ماحول اور اُس تمدن اور تہذیب کی مخلوق تھی جو مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئی اور جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں اور اُردو کے بنانے میں تو (یہ میرا ذاتی خیال ہے) ہندو شریکِ غالب تھے اور چونکہ یہ اس محل میں پیدا ہوئی جس کی تعمیر ہندو مسلمان دونوں کے ہاتھوں سے ہوئی اس لیے اس میں بہ نسبت کسی دوسری ہندی زبان کے عربی، فارسی کے الفاظ زیادہ تھے اور وہ بھی سب ملا کر کتنے؟ بقول مولانا حالی "جتنا آٹے میں نمک"۔ حیرت ہے کہ آریا اس ملک میں آئیں اور ہندی کہلائیں، مغل، ترک، عرب یہاں آباد ہوں اور ہندوستانی بن جائیں اور بیسیوں قومیں یہاں آئیں اور دیسی ہو جائیں لیکن بقول عورتوں کے "جنم جلے" لفظ ہی ایسے ہیں جو صدہا سال رہنے بسنے کے بعد بھی غیر کے غیر ہی رہے اور اپنے نہ ہونے پائے۔ اب انھیں محض اس شبہ پہ کرید کرید کر اور اُکھیڑ اُکھیڑ کر نکالنا نادانی نہیں دیوانہ پن ہے۔ قومی غرور میں اکثر ایسا ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر حرکتیں سرزد ہوتی ہیں، مثلاً جرمنوں نے لفظوں پر مشق کرتے کرتے انسانوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ جب لفظ ہماری زبان میں آگیا اور رس بس گیا تو وہ غیر زبان کا نہیں رہتا، ہمارا ہو جاتا ہے، اُسے اگر ہم نکال دیں تو سوائے ہماری زبان کے اس کا کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ نہ اس کی وہ پہلی سی صورت اور چہرہ مہرہ رہتا ہے اور نہ سیرت و خصلت۔ وہ اگر اپنی اصلی زبان کی طرف جائے گا تو پہچان بھی نہ پڑے گا اور کوئی اُسے وہاں گھسنے نہ دے گا۔ اس کے علاوہ اصل زبان کا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ نقصان ہے تو اس زبان کا جس میں یہ آکر بس گئے تھے اور جن کی وجہ سے اس زبان کی رونق، وسعت اور قوتِ اظہار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

زبان کی یہی گت اِس ہندی اردو جھگڑے میں بنی۔ عربی، فارسی ہی نے نہیں بلکہ ہندی کے معمولی لفظ بھی جو عام طور پر بول چال میں رائج ہیں خارج اور ان کی جگہ سنسکرت کے اصل لفظ داخل کیے جا رہے ہیں۔ یہ زبان کا بنانا نہیں بگاڑنا ہے۔

بعض حضرات نے اس نزاع کا الزام سر سید احمد خاں کے سر تھوپا ہے، ان کا بیان ہے کہ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کی تو ہندی اُردو کا جھگڑا پیدا ہوا۔ یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، جب یہ جھگڑا اُٹھا ہے تو اس وقت کانگرس کا وجود بھی نہ تھا۔ اس کے متعلق خود سر سید کا بیان موجود ہے، ہم اُسے کیوں نہ دیکھیں۔ وہ علی گڑھ کی تعلیمی سروے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشیٔ ہندستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے، اُس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربہ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے، اُس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔"

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے، اس کی ابتدا ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہوئی اور ایسے بُرے وقت ہوئی کہ اب تک ختم ہونے کو نہیں آیا، بلکہ دن بدن زور پکڑتا جاتا ہے۔ لیکن اُس وقت بھی بعض منصف مزاج اور عاقبت اندیش ہندو اہل قلم نے اس نئی تحریک کی مخالفت کی، چنانچہ ۱۸۶۹ء میں منشی حکم چند پروفیسر دہلی کالج نے ایک مدلّل اور محققانہ مضمون اس کی مخالفت میں لکھا، پروفیسر موصوف زبانوں کی حقیقت اور ارتقا وغیرہ پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالص زبان اور میل والی (مخلوط) زبان میں کیا خاص فرق ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے مقابلہ میں کیوں خاص اہمیت دی جاتی ہے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی زبان بھی ایسی کہی جاسکتی ہے جس میں بدیسی الفاظ شامل نہ ہو گئے ہوں، اگر کوئی ایسی زبان موجود ہو تو اس کو ترجیح کی

کوئی وجہ نہیں، میل والی زبان میں اجنبی الفاظ کچھ عرصے کے استعمال کے بعد کھپ جاتے ہیں اور مقامی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور اس میل والی زبان کو بھی ہم خالص زبان کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہ تمام امور اُردو زبان کی بحث سے خارج ہیں۔ اس واسطے کہ اُردو ایک زندہ زبان ہے اور اس قدر زمانے سے ہندوستان میں استعمال کی جا رہی ہے کہ اب اس کو ترک کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھایا جا سکتا یہ بحث بالکل بے نتیجہ ہے کہ آیا اُردو ایک خالص زبان ہے یا اس میں دوسری زبانوں کا بھی میل ہے۔ اب ہندو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس جگہ ہندی کو رواج دیں جس کا استعمال عرصے سے ترک کر دیا گیا ہے اور جس کی حیثیت اب ایسی ہی ہے جیسی کہ سنسکرت کی۔ ایک زمانہ تھا جب دِلّی والے جامہ پہنا کرتے تھے، لیکن اب لوگوں نے یہ لباس ترک کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ لباس پہنکر بازار میں جائے تو لوگ کیا کہیں گے؟ اکثر لوگ بہروپ سے تعبیر کریں گے۔ زبانوں کا بھی یہی حال ہے اب اگر آپ "بدن" کی جگہ "شریر" اور "شیر" کی جگہ "سنگھ" استعمال کریں تو لوگ آپ کی بات سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ فارسی رسم خط کی جگہ جو ناگری رسم خط استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ دراصل اگر ایک دفعہ بدیسی الفاظ کسی زبان میں چل جائیں تو زبان کو خالص بنانے کے لئے انہیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا اور نہ رسم خط بدلا جا سکتا ہے۔ فردوسی نے شاہنامے میں عربی الفاظ استعمال نہیں کئے لیکن کیا دوسرے فارسی شعرا جیسے خاقانی، انوری، نظامی وغیرہ اس کا تتبع کر سکے؟ برخلاف اس کے ان کے یہاں کثرت سے عربی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس اصول پر ہم اُردو میں عربی، فارسی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں؟ شہروں میں ہر چھوٹا بڑا اُردو بولتا ہے اور سرکاری دفاتر میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اردو میں اخبارات کی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اور تعداد میں ہر روز مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اُردو میں دوسری زبانوں کے

مطالب بیان کرنے کی بدرجۂ اتم صلاحیت پائی جاتی ہے ۔"

اسی زمانے میں گارساں دتاسی لکھتے ہیں کہ :

" باوجود ان مباحث کے جن کی نسبت ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے مسلم ہے ۔ ڈیوک آف اڈنبرا نے اسی زبان میں اپنے دوران سفر میں تقریریں کیں اور اسی زبان میں ڈیوک موصوف کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے گئے ۔ آج کل ساؤتھ کنزنگٹن میوزیم میں شہزادہ البرٹ کی جو نمائش ہو رہی ہے اس کے نیچے اُردو زبان میں کتبہ لکھا گیا ہے ۔"

اسی مضمون میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

" اگرچہ صوبۂ بنگال کی زبان بنگالی ہے لیکن اُردو جیسا کہ میں پیشتر بوضاحت بیان کر چکا ہوں ، وہاں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ چنانچہ راجا کالی کرشن پرشاد نے حال میں ملکۂ وکٹوریہ کی سالگرہ کے موقع پر سنسکرت میں جو نظم لکھی تھی اس کا اُردو میں بھی ترجمہ شائع کیا ہے جس کی ایک نقل انھوں نے مجھے بھی بھیجی ہے ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کا بنگالی ترجمہ شائع نہیں کیا ۔"

پھر لکھتے ہیں :

" اگر کوئی ہندو اسلامی حکومت کو بُرا کہے اور انگریزی نظم و نسق کا مداح ہو تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ، لیکن عربی ، فارسی اور اُردو جیسی زبانوں کے ساتھ تعصب برتنا کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ بابو شیو پرشاد جیسے عالم فاضل شخص سے مجھے اس کی توقع نہ تھی ، اس لیے ان کی تحریر دیکھ کر مجھے تعجب ہوا ۔ بابو صاحب خود اُردو نہایت عمدہ لکھتے ہیں اور متعدد تصانیف اس زبان میں شائع کر چکے ہیں ۔ یہ خواہش کرنا کہ ہندستان میں سوائے سنسکرت ، ہندی یا انگریزی کے اور کسی زبان کی تحصیل ہی نہ کی جائے ، میرے خیال میں تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے ۔ میں سید احمد خاں کی طرح اس باب میں زیادہ وسیع مشرب واقع ہوا ہوں ۔"

اس زمانے میں اس نئی تحریک پر بڑی گرماگرم بحثیں ہوئیں اور دونوں فریق نے

تائید و تردید میں خوب خوب دل کا بخار نکالا۔ اس زمانے کا کوئی اخبار یا رسالہ شاید ہی اس بحث سے خالی ہو۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے یہ بحث دھیمی پڑ گئی اور لوگ سیاسی اور معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن سر انٹنی میکڈانل کے عہد جبروت مہد میں اس دبی آگ کو پھونکیں مار مار کر سلگایا گیا اور ابھی کچھ دنوں دم نہ لینے پائے تھے کہ شدھی اور سنگھٹن نے وہ شعلے بھڑکائے جن کی آنچ اب تک کم نہیں ہوئی ہے اور جو آتا گیا ایک آدھ کپّا تیل اور لنڈھاتا گیا۔

انگریز بہت خوش اقبال ہے کہ ہر قرن اور ہر دَور میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آتی ہے کہ ہم آپس میں کٹ مرتے ہیں اور وہ اس کے مزے لیتا ہے۔

رشید احمد صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ میں ہندی اردو کے قضیئے سے بیزار ہوں۔ ان سے زیادہ میں بیزار ہوں۔ میں اب سے پہلے کبھی اس بحث میں نہیں پڑا تھا، یہ میرے شعار کے خلاف تھا بلکہ جہاں کہیں میں نے ضرورت سمجھی ہندی کی حمایت ہی کی۔ جامعۂ عثمانیہ میں ہندی کے رواج دینے میں تھوڑی سی میری ناچیز کوشش کو بھی دخل تھا۔ تین سال کا ذکر ہے کہ جب مدراس میں بعض پروفیسران اور دیگر صاحب ذوق اصحاب نے اُردو اکاڈیمی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت احاطۂ مدراس میں ہندی کی اشاعت اور پراپیگنڈے کا بھی ذکر آیا تو میں نے یہی کہا کہ ہمیں ہرگز اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے، جس قدر ان میں ہندی کا زیادہ رواج ہوگا اسی قدر وہ ہم سے زیادہ قریب ہو جائیں گے کیونکہ ہندی سے زیادہ ہندوستان کی کوئی زبان اُردو سے زیادہ قریب بلکہ اقرب نہیں ہے (افسوس ہے کہ مجھے قربت کا لفظ استعمال کرنا پڑا جس سے دوئی کی بُو آتی ہے حالانکہ کچھ پہلے ہماری ایک ہی زبان تھی)۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ واقعات کا خون کیا جا رہا ہے اور دانستہ یا نادانستہ طرح طرح کی غلط بیانیاں پھیلائی جا رہی ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے جھجکتے جھجکتے اپنی طبیعت کے خلاف اپنی کم زور آواز اور اس سے بھی کم زور اپنے قلم سے کسی قدر کام لیا۔ مجبوری میں آدمی کو کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔

حال میں اس معاملے میں دو قسم کی غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں ایک یہ کہ ہندی دو ہزار برس سے یہاں جاری ہے اور یہی ہندستانی زبان ہونا چاہیے۔ ہندی کا لفظ عام ہے، اس کا اطلاق برج بھاشا، اودھی، بندیلی، بگھیلی، راجستھانی، بھوجپوری میتھلی، چھتیس گڑھی وغیرہ وغیرہ پر اس طرح ہوتا ہے جس طرح اردو پر ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک زمانہ میں ہندی کہلاتی تھی۔ مگر وہ ہندی جس کی خاطر یہ سارا طوفان برپا کیا گیا ہے اس کی پیدائش کو بقول شخصے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے (خدا ان کی ارواح کو شرمائے) بیٹھے بٹھائے بلا وجہ اور بغیر ضرورت یہ شوشہ چھوڑا۔ للوجی لال نے جو اردو کے زباندان اور اردو کتابوں کے مصنف بھی تھے، اس کی بنا ڈالی، وہ اس طرح کہ اردو کی بعض کتابیں لے کر انھوں نے ان میں سے عربی، فارسی لفظ چن چن کر الگ نکال دیے اور ان کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے نامانوس لفظ جما دیے۔ یہی ہندی بن گئی۔ جدید ہندی کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ابتدا اسی طرح سے ہوئی، یہاں میں بخوف طوالت ان راؤں کو نقل نہیں کرنا چاہتا — اور یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل ہے اور بھدی ہے۔ فنز ایڈورڈ ہال جو ایک جید عالم ہوئے ہیں اور ہندی زبان کے بڑے حامیوں میں سے تھے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

> "ہندی زبان جیسی کہ وہ آج کل مستعمل ہے در اصل بالکل جدید زبان ہے اور انیسویں صدی کے خاتمے پر جو ہندی رائج ہوگی وہ بہت مختلف ہو جائے گی"

ان کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح نکلی۔

دوسری غلط بیانی یہ کی گئی ہے کہ اردو کو مسلمان بادشاہوں نے حکومت کے زور سے پھیلایا اور اس وقت ہندوؤں نے بحالتِ مجبوری سیاسی مصلحت سے قبول کر لیا۔ یہ بیان سر تا پا غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ بات اگر کوئی اور کہتا تو قابل التفات نہ ہوتی۔ لیکن یہ الفاظ ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں جو اردو اور ہندی دونوں کا مسلّم ادیب تھا اور اپنے اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے معمولی آدمی نہ تھا

اس لیے اور بھی زیادہ تعجب اور افسوس ہوتا ہے ۔ اردو زبان کی تاریخ ایسی صاف اور کھلی چیز ہے کہ اس پر بحث کرنے یا اس بیان کی تردید کرنے کی مطلق ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ مسلمان بادشاہوں کے دربار اور دفتر کی زبان ہمیشہ فارسی رہی ان کو اتنی توفیق ہی نہ ہوئی کہ وہ غریب اُردو کی طرف توجہ فرماتے اور توجہ کی تو کس وقت جب نہ سلطنت رہی، نہ حکومت اور ظاہر ہے ایسے وقت میں ان کا اثر ہی کیا ہو سکتا ہے ۔ اُردو زبان جدید ہندی کی طرح کسی نے بنائی نہیں، وہ تو خود بخود بن گئی اور ان قدرتی حالات نے بنائی جن پر کسی کو قدرت نہ تھی ۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اور اگر ہندوؤں کی اس میں شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی ۔ مسلمان بادشاہوں پر یوں تو بہت سے الزام عائد کیے گئے ہیں لیکن یہ بالکل نیا الزام ہے اور حال ہی میں گھڑا گیا ہے ۔

حضرات! اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اُردو کی مقبولیت کے کیا اسباب ہوئے ۔ سب سے بڑی وجہ اس کی مقبولیت عام کی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد عوام کی زبان پر رکھی گئی تھی جو بول چال کی زبان تھی ۔ خود اُردو کا لفظ ہی اس کی اصل اور ابتدا کا پتا دیتا ہے ۔ اس وقت جتنی شائستہ اور اعلیٰ درجہ کی زبانیں ہیں جن کی دھاک ساری دنیا پر بیٹھی ہوئی ہے وہ ایک وقت میں عوام کی معمولی بولیاں تھیں اور حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، یہاں تک کہ خود اہل زبان اس میں لکھنا پسند نہ کرتے تھے ۔ بعینہ یہی حال پہلے پہلے اُردو کا بھی تھا ۔ اس کے بولنے والے بھی اس میں لکھتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور جو کبھی کوئی لکھتا اور وہ بھی مذہبی ضرورت سے ہوتا تھا، تو پہلے معذرت کرتا کہ چونکہ سب لوگ عربی فارسی نہیں جانتے اس لیے ان کے خیال سے اس زبان میں لکھ رہا ہوں، لیکن آخر یہی عوام کی بولی رفتہ رفتہ شائستہ اور ادبی زبان بن گئی، اور اس کا تعلق برابر عوام کی بولی سے رہا ۔ میں نے جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسے میں یہ کہا تھا کہ اُردو میں ہندی زبان کے الفاظ اور محاورے اور امثال جدید ہندی کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں تو یہ میں نے محض دھونس بٹھانے کے لئے نہیں

کہاتھا بلکہ یہ امرواقعی ہے۔ ادبی زبان بننے پربھی وہ عوام کی بولی سے جدا نہیں ہوئی،
برخلاف جدید ہندی کے کہ وہ کتابی زبان ہے انھیں جب کبھی الفاظ کی ضرورت پڑی تو
اُنھوں نے سنسکرت کے ذخیرے کو ٹٹولا، ہمارے پاس پہلے سے ہندی کے لفظ موجود تھے
اور بعد میں بھی ہم نے ہندی سے نئے لفظ لینے میں بخل نہیں کیا۔ عوام کی زبان مثل قلب کے
ہے جس سے تمام اعضا کو خون پہنچتا رہتا ہے اور ان کی تقویت کا باعث ہوتا ہے جب تک
زبان کو عوام کی بولی سے مدد ملتی رہتی ہے اور وہ عوام کی بولی کا ساتھ دیتی رہتی ہے
تو وہ زندہ رہتی ہے اور جس وقت سے اس کا تعلق عوام کی بولی سے منقطع ہوجاتا ہے تو
اسی وقت سے اس پر مُردنی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ یونانی، سنسکرت،
لاطینی جو دنیا کی کامل اور بہترین زبانیں خیال کی جاتی ہیں، اسی لیے مردہ ہوگئیں۔

البتہ اُردو پر ایک ایسا تاریک زمانہ آیا کہ ہمارے شعرا نے اکثر ہندی لفظوں کو
متروک قرار دیا، اور ان کے بجائے عربی فارسی کے لفظ بھرنے شروع کیے اور یہی نہیں
بلکہ بعض عربی فارسی الفاظ جو بہ تغیر ہیئت یا بہ تغیر تلفظ اُردو میں داخل ہوگئے تھے،
انھیں بھی غلط قرار دے کر اصل صورت میں پیش کیا اور اس کا نام "اصلاح زبان"
رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تکلف اور تصنع ہمارے ادب پر چھاگئے تھے، شاعری ضلع جگت
ہوگئی تھی، ہمارے سخنوروں نے لفظوں کو کھیل بنالیا تھا، شاعر کا مقصد کچھ کہنا نہیں ہوتا تھا
بلکہ اس کا کام قافیے کی رعایت سے لفظوں کو جما دینا، ان میں صنائع بدائع کا رنگ بھر دینا
قافیہ، ردیف کھپا دینا اور محاوروں کا نبھا دینا رہ گیا تھا۔ اس میلان کی وجہ سے ہماری شاعری
رنگ برنگ لفظوں کا ایک ڈھانچا تھی جس پر طرح طرح کی نقاشی کی ہوئی تھی لیکن اس میں
جان نہ تھی اور ہماری زبان ایک ایسی زبان ہوگئی تھی کہ اُسے بہت کم انسان بولتے تھے
غرض اس رنگ نے ہمارے ادب کو بے جان، بے لطف اور بے اثر بنا دیا تھا۔

لیکن یہ دور تاریکی چند روزہ تھا، اس کے رفع کرنے میں سب سے بڑا کام
سرسید احمد خاں نے کیا۔ اس کی تحریروں نے ہمارے ادب میں نئی جان ڈال دی اگرچہ
اُس کی زبان اور اُس کا انداز بیان سادہ تھا۔ لیکن اس میں فصاحت، اثر اور قوت تھی

اُس نے علمی اور سنجیدہ مضامین لکھنے کا نیا ڈول ڈالا، اور موافق و مخالف دونوں نے اس کی پیروی کی اور اس کے رفقا یعنی نذیر احمد، شبلی، حالی، ذکاراللہ خاں وغیرہ نے اسے اور چمکایا اور بڑھایا۔ سید احمد خاں کا اُردو زبان پر بڑا احسان ہے اس نے صرف ہمارے ادب ہی کو نہیں بنایا اور سنوارا بلکہ ہر موقع پر جب ضرورت پڑی اس کی حمایت کی اور اس پر آنچ نہ آنے دی۔ سرسید کی وجہ سے اب اُردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے جو "علی گڑھ اسکول" کے نام سے موسوم ہے۔

اس نئے اسکول نے پھر عام بول چال کی طرف رجوع کی اور خاص کر نذیر احمد، حالی، آزاد، ذکاراللہ نے اُن الفاظ کو جو گھروں کے کونوں، کھدروں، گلیوں، بازاروں اور کھیتوں میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے تھے چن چن کے نکالا انھیں جھاڑا پونچھا، صاف کیا، جلا دی اور ان میں سے بہت سے اچھوتوں کو مسندِ عزت پر لا بٹھایا۔ اس نئے خون نے جو ہمیشہ ہماری زبان کی رگ و پے میں پہنچتا رہا ہے، ہمارے ادب کی رونق اور تازگی کو دوبالا کر دیا۔

حضرات! اُردو کی مقبولیت کی ایک اور وجہ بھی ہوئی جو قابل غور ہے جس وقت یہ زبان وجود میں آئی تو ملک میں جتنی بولیاں مروج تھیں وہ سب اپنے چھوٹے چھوٹے رقبوں اور حلقوں میں محدود تھیں، یہ زبان قدرت سے ایسے ماحول اور ایسے حالات اور اس قسم کے اثرات کے تحت بنی تھی اور اس طرح سے اس کی ترکیب عمل میں آئی تھی کہ وہ خود بخود ملک کے اکثر خطّوں میں پھیلتی چلی گئی اور لوگ اسے قبول کرتے چلے گئے۔ ملک میں کوئی دوسری بولی یا زبان ایسی نہ تھی جو اس کا مقابلہ کرتی اور جتنی بولیاں یا زبانیں تھیں وہ اپنے حلقے سے باہر نہ بولی جاتی تھیں اور نہ سمجھی جاتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ جب اہل یورپ اور خصوصاً انگریز اس ملک میں آئے تو اُنھوں نے اسے ہندستانی یعنی ہندوستان کی زبان سے موسوم کیا اور یہی وجہ ہے کہ جب فارسی کے بجائے اُردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی تو کسی نے اختلاف نہ کیا۔ اختلاف ہوتا تو کس بنا پر؟ کوئی دوسری زبان ایسی تھی ہی نہیں جو ہندوستانی ہونے کا دعویٰ کرتی۔

اُردو زبان کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جس پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ وہ عورتوں کی زبان ہے۔ یوں تو دنیا میں اور بھی زبانیں ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی بول چال میں کچھ کچھ فرق ہے لیکن اُردو زبان میں یہ امتیاز بہت نمایاں اور گہرا ہے۔ اُردو نے جس خطّے میں جنم لیا یا جہاں جہاں اس نے زیادہ رواج پایا وہاں پردے کی رسم رائج رہی ہے۔ اسی وجہ سے مردوں اور عورتوں کی معاشرت میں بہت کچھ فرق پیدا ہو گیا۔ عورتوں کے الفاظ اور محاورے اور ان کا طرز بیان اور بول چال بھی بہت کچھ الگ ہو گئی۔ عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے، وہ انسانوں یا چیزوں میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا کمزوریاں دیکھ لیتی ہیں جن پر مردوں کی نظر نہیں پڑتی۔ پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کا سارا وقت امورِ خانہ داری، بال بچّوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسم و رواج کی پابندی اور ان کے متعلق جتنے معاملات ہیں اسی میں صرف ہوتا ہے اور اس اقلیم میں ان کی عملداری کامل ہوتی ہے۔ پھر ان کی زبان اور لہجے میں لطافت، نزاکت اور لوچ ہوتا ہے اس لیے اُنھوں نے اپنے تعلقات کے لحاظ سے جو طرح طرح کے لفظ، محاورے، اور تشبیہیں بنائی ہیں۔ وہ بڑی لطیف، نازک، خوبصورت اور سبک ہیں۔ وہ گیت جو عورتوں نے بنائے ہیں بہت ہی پُرلطف اور دل کش ہیں اور نفسیاتی اعتبار سے خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ ایسے الفاظ جن کا زبان سے نکالنا بدتمیزی سمجھا جاتا ہے یا جن کے لکھنے میں شرم و حجاب مانع ہوتا ہے، عورتیں ایسے الفاظ نہیں بولتیں بلکہ وہ اس مفہوم کو لطیف پیرایہ میں یا تشبیہ و استعارے کے رنگ میں بڑی خوبصورتی سے بیان کر جاتی ہیں۔ عربی فارسی کے ثقیل الفاظ جن کا تلفظ آسانی سے ادا نہیں ہوتا وہ انھیں بہت سڈول بنا لیتی ہیں، بعض اوقات ان کے معنی تک بدل جاتے ہیں اور وہ خالص اُردو کے لفظ ہو جاتے ہیں۔ ہماری عورتوں کے الفاظ اور محاورے وغیرہ زیادہ تر ہندی ہیں یا عربی فارسی کے لفظ ہیں تو انھیں ایسا تراشا ہے کہ اُن میں اُردو کی چمک دمک پیدا ہو گئی ہے۔ اب جدید حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ جہاں ہماری اور بہت سی عزیز چیزیں مٹتی جاتی ہیں یہ لطیف زبان بھی مٹتی جاتی ہے۔ ریختی گو

شعرا کا بڑا احسان ہے (اگرچہ ان میں سے بعض نے بہت کچھ فحش بھی بکا ہے) کہ اُنھوں نے اس زبان کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس زبان کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ اور محاورے اور مثلیں ادبی زبان میں آگئی ہیں اور ہمارے ادب کی زیب و زینت ہیں۔ اِس زمانے میں نذیر احمد، حالی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری اور بعض دیگر اصحاب کی بدولت صنف نازک کی اس پاکیزہ زبان کا اکثر حصّہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہو گیا ہے۔ اس کے اضافہ سے ہماری زبان میں شگفتگی اور حسن ہی نہیں پیدا ہوا بلکہ اسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

حضرات! آج کل ہر طرف سے یہ آوازہ سنائی دی جا رہی ہے کہ "سادہ زبان لکھو۔ سہل لکھو"، گویا سادہ اور سہل لکھنا معمولی بات ہے۔ ایک ادیب کا قول ہے کہ "ایک اعلیٰ درجہ کے باکمال شخص اور ایک احمق میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے اور وہ ہے سادگی"۔ ایسی سادہ زبان لکھنا جس میں سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہو صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ محض سیدھے سادے لفظ جمع کر دینا اور سپاٹ بے لطف، بے جان تحریر لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ ہر شخص کا طرز اور اسلوب بیان جدا ہوتا ہے، ادب و شعر میں کوئی کسی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ یوں نہیں یوں لکھو۔ حکم سے یا فرمائش سے کسی کو سادہ لکھنا نہیں آسکتا۔ زبان میں ہر قسم کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مضمون یا مقتضائے حال کے مطابق جو الفاظ موزوں اور برمحل ہوں استعمال کرے، جب ہم کسی بچّے یا کسی گنوار سے باتیں کرتے ہیں، بچّوں کے لئے کوئی کتاب لکھتے ہیں تو خود بخود سادہ زبان استعمال کرتے ہیں، سادہ یا مشکل، فصیح یا سلیس لکھنا حالات اور ضرورت پر منحصر ہے اور زیادہ تر لکھنے والے پر اس کا انحصار ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کس سے کہنا چاہتا ہے۔ ہماری زبان ہمیں عوام سے، اَن پڑھ لوگوں سے، گنواروں سے، سپاہیوں سے پہنچی ہے اور اسی لیے اس کا تعلق کبھی عوام سے منقطع نہیں ہونا چاہیئے۔ بڑا آدمی وہ ہے جس کی آواز سیکڑوں ہزاروں تک پہنچتی ہے اور اس سے بھی بڑا وہ ہے جس کی آواز لاکھوں کروڑوں تک پہنچتی ہے،

اور دنیا میں سب سے بڑا وہ ہے جس کا پیام تمام بنی نوع انسان تک پہنچتا ہے لیکن جس کا پیام جس قدر سادہ الفاظ میں ہوگا اسی قدر زیادہ انسانوں تک پہنچے گا۔ سید احمد خاں بڑا شخص ہوا ہے کیونکہ اُس کی آواز لاکھوں آدمیوں تک پہنچتی تھی، اس لیے کہ اس کی تحریر سادہ پُر اثر اور پُر خلوص تھی۔ اگر ہمیں اپنے بھائیوں کا درد ہے تو ہماری تقریر اور تحریر ضرور سادہ اور سہل ہوگی لیکن بیچارے ادیب یا مصنف ہی کی گردن دبانا کہ "تو سہل لکھ" ٹھیک نہیں ہے ہمیں دوسرے پہلو کو بھی دیکھنا چاہیے۔ آسان اور مشکل اضافی کلمے ہیں ممکن ہے کہ جو چیز مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے وہ آپکے لیے آسان ہو اور جسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ آپ کے لیے مشکل ہو۔ انگریزی کی ایک بہت آسان کتاب لیجیے اور اس کا ترجمہ اُردو میں کیجیے اُردو میں آکر یہ آسان کتاب مشکل ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اصل کتاب جس ملک والوں کے لیے لکھی گئی تھی وہاں تعلیم عام ہے، پڑھے لکھوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ الفاظ اور محاورے اور اصطلاحیں جو اس کتاب میں آئی ہیں اُنھیں وہاں بچّہ بچّہ جانتا ہے۔ اب جو ہم نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا تو پڑھے لکھے بھی اسے نہیں سمجھتے۔ پڑھے لکھے تو رہے ایک طرف بعض وقت خود مترجم نہیں سمجھتا کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ اس لیے جہاں سادہ لکھنے کی فرمائش اور چیخ پکار ہے وہاں اپنے ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر کچھ ناخواندہ طبقہ ذرا اوپر اُٹھے گا اور کچھ ہمارے ادیب اور مصنف ذرا نیچے جُھکیں گے، اس طرح دونوں کے درمیان تفاوت کم رہ جائے گا اور وہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھنے لگیں گے۔

یہ کچھ ایسی مشکل نہیں ہے۔ لیکن ہماری مشکلات اور بھی ہیں اور ان کی طرف اب خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے مگر اب تک ان کے حل کرنے کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ ان میں سے ایک علمی اصطلاحات کا ترجمہ ہے۔ میں اس کے متعلق بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن یہاں نہ اتنا وقت ہے اور نہ مجھے اتنی فرصت ملی کہ تفصیل سے کچھ لکھتا۔ لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم نے جو اصطلاحات کو ہوّا بنا رکھا ہے یہ کوئی اچھی بات

نہیں۔ قدیم زمانے میں پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں نے مذہب کو اور اہل علم نے علم کو پُر اسرار بنا رکھا تھا۔ وہ عام آدمی کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور اس لیے علم ایک خاص طبقے کے قبضہ میں رہتا تھا۔ عام کرنے سے ان کے اقتدار میں فرق آتا تھا۔ اسے قائم رکھنے کے لیے انھوں نے ایسی اصطلاحات گھڑلی تھیں جنھیں دیکھتے ہی آدمی مرعوب ہو جائے۔ یہ خیال تو رفتہ رفتہ جاتا رہا لیکن اس کا اثر باقی رہ گیا۔ آپ نے انگریزی میں لاطینی اور یونانی زبانوں سے مشتق اصطلاحیں دیکھی ہونگی جو بہت بے ڈھنگی، بے ڈول اور بھیانک ہیں۔ ہمیں اس کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہو ہمیں اصطلاحات کے لیے ایسے الفاظ رکھنے چاہیئں کہ ایک معمولی لکھا پڑھا شخص بھی اس کے کسی جزو سے واقف ہو اور لفظ اور مفہوم میں جو تعلق ہو اُسے تھوڑا بہت پالے؛ اِس سے اُسے معنی کے سمجھنے میں بھی آسانی ہوگی اور اصطلاح کے یاد رکھنے میں بھی۔

اسی طرح رسم الخط اور املا کی اصلاح اور سہل بنانے کا مسئلہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے ٹائپ کے بنانے کا مسئلہ ہے جو ہماری زبانوں کے لیے موزوں ہو۔

یہ سب مسائل ہماری توجہ کے قابل ہیں۔ ہمیں ایک طرف اپنے ادب کو مستحکم اور علوم و فنون سے مالا مال کرنا ہے اور دوسری طرف اپنی زبان کی اشاعت منظور ہے، اس لیے ان تمام وسائل اور ذرائع پر غور کرنا ہمارا فرض ہے جو ہماری زبان کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں، ان تمام امور پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن انجمن ترقی اُردو ان سب پر غور کر رہی ہے اور انشاء اللہ جلد ان کو عمل میں لانے کی کوشش کرے گی۔

اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ ہماری زبان ہی ایسی زبان ہے جو سارے ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہو سکتی ہے، اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہے، اگر ہم سچے دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبان ہماری تہذیب اور ہماری زندگی کا جزو ہے تو صاحبو! اگر ہمیں اس کے لیے زیادہ نہیں تو تھوڑا سا ترددد، تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنی پڑے تو اس سے گریز نہ کریں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ جب کوئی دوسرا اس کے لیے سرگردانی کے لیے تیار ہو تو اس کا ہاتھ بٹانے میں دریغ نہ کیا جائے۔

خطبۂ صدارت

شعبۂ صنعتی تعلیم

از خان بہادر اے جی خان بی اے علیگ ایم ایس سی ٹیکنیکل
مانچسٹر، ایم آئی ای ای (لندن)، ایم آئی میک ای (لندن)
ایم آئی ای (انڈیا)

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر شعبہ کا علیحدہ صدر اور ایک مستقل سکرٹری تھا۔

منجملہ ان شعبوں کے ایک شعبہ "صنعتی تعلیم" بھی تھا جس کے صدر خان بہادر اے جی خاں بی اے علیگ تھے اور سکرٹری ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور مسٹر عبیداللہ دُرّانی ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ تھے۔

اس شعبہ کا اجلاس ۲۸ مارچ کو بوقت ۹ بجے شب آفتاب ہال میں منعقد ہوا، خان بہادر اے جی خاں صاحب نے اجلاس میں جو خطبہ پڑھا وہ حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ صدارت

از خان بہادر اے، جی خان بی اے علیگ ایم ایس سی ٹیکنیکل مانچسٹر ایم آئی، ای (لندن) ایم آئی میک، ای (لندن) ایم آئی، ای (انڈیا)

جو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی کے موقع پر شعبۂ تعلیم صنعت کے اجلاس میں مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۷ء بمقام علی گڑھ پڑھا

حضرات!

آج رات ہم یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جدید شعبۂ صنعت کا پہلا اجلاس منعقد کریں،

(۲) کارکنان کانفرنس نے صنعتی تعلیم کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک نیا شعبہ قائم کر کے قابل تعریف تخیل اور بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ قدم ترقی کی منزل پر پہونچنے کے لئے بہت ضروری ہے اور طلائی جوبلی کا نہایت شاندار کارنامہ بھی ہے

(۳) میں کارکنان کانفرنس کا بہت شکر گزار ہوں جنھوں نے مجکو یہ اعزاز بخشا کہ اس اجلاس کی صدارت کے فرائض انجام دوں، اس اعزاز کو قبول کرنے میں مجھ کو کچھ تامل ضرور ہوا کیونکہ اس بھاری ذمہ داری کا جو مجھ پر عائد ہوتی ہے مجھے پورا پورا احساس ہے مگر مجھ کو یقین واثق ہے کہ آپ کی رفاقت اور امداد سے میری حوصلہ افزائی ہوتی رہے گی، اور ہم مسلم قوم کی توجہ کو اُس ضروری امر پر مبذول کر سکیں گے جس کے لئے یہ شعبہ قائم کیا گیا ہے۔

(۴) حضرات! آپ صوبجات متحدہ کی کمیٹی علاج بے روزگاری (جس کی صدارت رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کے سپرد تھی) کی جاندار سفارشوں اور کارآمد فیصلوں سے آگاہ ہوں گے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے دو نمایاں حصے ذیل میں پیش کرتا ہوں:-

(الف) جہاں تک ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا اتنا ہی یقین راسخ پایا کہ بمقتضائے وقت ہم کو اپنی تعلیمی پالسی پر نظر ثانی کرنا بہت ضروری ہے،

(ب) جو شہادت ہمارے سامنے پیش ہے اُس سے ہم یقین کرتے ہیں کہ ان صوبجات میں دستکاری اور پیشہ وری کی تعلیم کو پھیلانے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے،

(۵) رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو نے پنجاب یونیورسٹی میں گزشتہ کانووکیشن کے موقع پر موجودہ طریقۂ تعلیم پر توجہ دلائی اور فرمایا کہ بے روزگاری کا مسئلہ جہاں تک اس کا تعلق تعلیم یافتہ لوگوں سے ہے کبھی حل نہیں ہو سکتا جب تک ہم سلسلۂ تعلیم کی از سر نو تنظیم نہ کرلیں یعنی ہم آدمی کو صرف مہذب ہی نہ بنائیں بلکہ ایسا دماغ بھی تیار کریں جو عملی کام کے قابل ہو اور جو اقتصادی طور پر قوم کے لئے مفید ثابت ہوں،

(۶) چند ماہ ہوئے کہ تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ کے دوسرے سالانہ جلسہ میں آنریبل کنور سر جگدیش پرشاد نے جو گورنمنٹ انڈیا کے محکمۂ تعلیم کے ممبر انچارج ہیں فرمایا کہ ہزاروں نوجوانوں کا زندگی کی کش مکش میں بے مقصد تگ و دو کا نظارہ کس قدر حسرتناک اور تکلیف دہ ہے اور یہ سوال بھی پیش کیا کہ آیا یہ جوانی کی امیدوں خواہشوں اور کوششوں کی بربادی لابدی ہے؟ اس کا جواب سر ہیری ہیگ گورنر صوبجات متحدہ

کی اس تقریر میں ملے گا جو انہوں نے بنارس یونیورسٹی کے معائنہ کے وقت فرمائی ہز ایکسیلینسی نے کہا کہ ہر قسم کی تعلیم میں بہت بڑی توسیع ہمارے سامنے ہو رہی ہے کچھ عرصہ تک تو یہ خیال رہا کہ توسیع تعلیم خود مقصود بالذات ہے اور اس سے آگے نظر دوڑانا غیر ضروری ہے لیکن کچھ عرصے سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا رشتہ ملک کی طرز زندگی اور فارغ التحصیل نوجوانوں کے برسر روزگار ہونے سے وابستہ ہونا چاہیئے،

میرا خیال ہے کہ بنارس ہندو یونیورسٹی نے انجنیری اور سائنس کے شعبہ جات میں ترقی دے کر اس اصلیت کے سمجھنے کا ثبوت دیا ہے،

(۷) حضرات! اس پر عام رائے کا اتفاق ہے کہ موجودہ تعلیمی پالسی کو از سر نو منظم کرنے کی ضرورت ہے اور صنعتی تعلیم کو (بشمولیت تعلیم دستکاری اور پیشہ دری کے ہمارے آئندہ سلسلہ تعلیم میں نمایاں جگہ دی جائے،

۸ - موجودہ سلسلۂ تعلیم کی پیداوار کے بہت بڑے حصہ پر (جو مناسب روزگار حاصل کرنے کے قابل نہیں ہے) چند گزشتہ سالوں سے روپیہ اور محنت کے صرف بیجا پر ہر جماعت کو غور کی ضرورت ہے خاص کر مسلمانوں کے لئے جو مفلس ہیں اور تجارت و دستکاری میں بھی پسماندہ ہیں اور ایسی فضول خرچی کو برداشت نہیں کرسکتے - جن لوگوں کی رائے قابل وقعت ہے وہ صاف الفاظ میں متنبہ کر چکے ہیں اور اس امر کو پورا پورا واضح کر دیا ہے کہ اس نقصان کا روکنا ضروری ہے خاص قسم کی صنعتی تعلیم میں توسیع اور ترقی دی جائے تاکہ ہر ایک طالب علم اس خاص صنعتی تعلیم کو جو اس کے مذاق اور میلان طبیعت کے موافق ہو حاصل کر سکے،

۹ - مناسب حال صنعتی تعلیم کی ضرورت روز بروز بڑھ رہی ہے صحیح قسم کی صنعتی تعلیم آئندہ زمانہ میں اور بھی ضروری ہو جائے گی جب مقابلہ بہ نسبت ماضی اور حال کے زیادہ سخت ہو جائے گا - ہر اس شخص کو جو تعلیم کا خواہش مند ہو گا (نہ صرف تعلیم ہی کی غرض سے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی روزی کمانے کے بھی قابل ہو سکے) تمام موزوں ہتھیاروں سے جو صنعتی اور عام تعلیم کے لئے ضروری ہیں آراستہ ہونا پڑے گا،

یہ امر متفقہ ہے کہ صنعتی تعلیم کے لئے سہولتیں پیدا کی جائیں اور ایسے طریقوں پر ڈھالا جائے جو اس کو بہت کار آمد بنا سکیں، غالباً یہ مفید ہوگا اگر میں اس تعلیم کے متعلق چند ضروری امور کا ایک واضح خاکہ پیش کروں،

صنعتی تعلیم کی اصطلاح تمام قسم کی صنعتی تعلیم اور ہر قسم کی کار آموزی پر حاوی ہے،

کاروبار کے مدارج تین بڑے بڑے حصوں میں دکھائے جا سکتے ہیں،

(الف) ناخواندہ۔ مثلاً اناڑی مزدور، اس طبقہ کا ذکر یہاں ضروری نہیں،

(ب) دستکار۔ نیم کاریگر یا کاریگر مزدور، بجلی کا کام جاننے والا وغیرہ اس قسم کے لوگوں کو ایسی صنعتی تعلیم کی ضرورت ہے جیسا کہ دستکاری پیشہ وری اور تجارتی تعلیم کے مدارس میں دی جاتی ہے،

بعض کام ایسے ہیں کہ ان کے لئے دستکاری میں اعلیٰ درجہ کی مہارت ضروری ہے اور کچھ کام ایسے بھی ہیں کہ ان کے لئے ترکیب ساخت کا وسیع تجربہ درکار ہے،

حروف شناسی کا کسی قدر ہونا یا نہ ہونا، صنعتی تعلیم کی سرسری واقفیت اور کسی خاص قسم کی عملی تعلیم کا وسیع نصاب ضروری امور ہیں، ایسی تعلیم اور وسیع تجربہ جو حاصل ہوا ہو یا ابتدائی اور صنعتی تعلیم اعلیٰ جگہوں کے لئے (مثلاً اعلیٰ چارج ہینڈ، اعلیٰ فورمین "اعلیٰ کاریگر وغیرہ) امیدوار مہیا کر سکتی ہے،

(ج) تعلیم یافتہ اور صنعتی تعلیم یافتہ لوگ۔ اس قسم کے لوگ ادنیٰ اور اعلیٰ درجوں کی صنعت و حرفت کی جگہوں کے لئے کاریگر مہیا کرتے ہیں جو ایک سب اوورسیر سے لیکر مکمل سند یافتہ کامل انجنیر تک سب درجوں پر بخوبی حاوی ہو سکتے ہیں اور جن کا انحصار ان کی عام اور صنعتی تعلیم کے معیار پر موقوف ہے،

(۱۰) سند یافتہ یا اس کے ہم پلہ انجنیر کی تعلیم و تربیت کے متعلق مندرجہ ذیل امور نظر انداز نہیں ہو سکتے وہ اسکول جو اتفاقیہ اور تجربتہً قائم ہوتے ہیں محض بیکار اور ردی ثابت ہوتے ہیں، تجارت، آموزکاری، پیشہ وری یا دستکاری کے تعلیمی ادارے جو صنعتی اور عام تعلیم پر اصرار نہیں کرتے، ترقی کے لئے محدود حلقہ پیش کرتے ہیں، سند یافتہ

(چارٹرڈ) یا اس کے ہم پلہ انجنیر کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک خاص درجہ کے معیار کی ضرورت ہے اس معیار کے لئے مندرجۂ ذیل امور طے کرنے ہوں گے:۔

(الف) طالب علم کی دماغی اور تمدنی نشو و نما،

(ب) سائنس اور ریاضی کے علوم سے کافی واقفیت،

(ج) فنی سائنس اور ریاضی کے ایسے علم کی واقفیت جو انجنیری کے کام میں نہایت ضروری اور درکار ہو،

(د) صنعتی مضامین میں اصول کی تعلیم اور عملی کام کی واقفیت، دماغی اور تمدنی نشو و نما جس کا مقصد ایسی ذہنی ترقی ہے جو انسان کو مہذب اور شائستہ بنا دے، عام تعلیم کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے،

طالب علم کو ابتدائی عام تعلیم پرائمری یا ثانوی درجہ کے اسکولوں اور اوائل عمر کی صحبتوں سے حاصل ہوتی ہے، سائنس اور ریاضی کے علوم ثانوی مدارس، کالجوں اور صنعتی اداروں میں حاصل ہوتے ہیں،

فنی سائنس اور ریاضی اور دیگر صنعت کے مضامین صنعتی اداروں میں سکھلائے جاتے ہیں،

اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کی محنت و کوشش اور تجربے رائیگاں نہ جائیں جو اب نہایت بے دردی سے ضائع ہو رہے ہیں،

اگر قوم کی خواہش ہے کہ ہندوستان کی زراعت، دستکاری اور تجارتی ترقی میں اپنا مناسب حصہ لے جس کی ضرورت جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا بڑھتی جائے گی،

اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ اُن کے وہ افراد جو تعلیم کو محض تعلیم ہی کی خاطر حاصل نہیں کرتے بلکہ روزی اور معقول روزی کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں زندگی میں کامیاب ہوں تو نہایت ضروری ہے کہ کتابی تعلیم جو دی جائے نہایت عمدہ اور وسیع پیمانہ پر ہو، صنعت، پیشہ وری اور دستکاری کی تعلیم کیلئے اول درجہ کی سہولتیں مہیا کی جائیں جو ہر ایک طالب علم کے مذاق، میلان طبیعت اور قابلیت کے موافق ہو جائے، مالیات اور تگ و دو کے وسیلے محدود ہیں، یہ سائنس اور فن انجنیری میں نہایت قیمتی حصہ ہوں گے، اگر انکو خراب اور ضائع ہونے دیا گیا ان کو ایسے طریقوں پر لگایا جائے جو طلباء کیلئے زیادہ مفید اور قوم کیلئے بیشتر نفع بخش اور ملک کیلئے زیادہ حوصلہ افزا ہوں۔

دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے بھرہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرمانروائی کا پیام سُننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہے جو ایک امّی نبی نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملت اسلامی اس تقدیر، اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی؟

اس سوال کا جواب آپ کے ذمہ ہے۔ اس لئے کہ قوم کے عام نصب العین کو بدلنے کا کام اس کے مدبروں اور مفکروں، اس کے ادیبوں اور شاعروں، اس کے دینی خادموں اور سیاسی کارکنوں کا بھی ہے اور اس کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا بھی۔ اسی لئے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے اس مرکز میں جہاں اکابر ملت اس خاص موقع پر مجتمع ہیں میں نے آپ کی توجہ اس طرف منعطف کرانے کی جرأت کی۔ اگر آپ اپنی حیات قومی کی موجودہ حالت پر مطمئن نہیں ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ قوم کو ان مضر خیالات اور مہلک ذہنی عادات سے نجات دلائیں جن سے اس کا وجود خطرہ میں ہے۔ جوں جوں آپ قومی تخیل میں اس نئے، مگر در اصل پرانے نصب العین کو جاگزیں کرتے جائیں گے آپ کا نظام تعلیم اس کے ساتھ ساتھ بدلنے پر مجبور ہوگا اور ایک نظام تعلیم کیا حیات ملی کے تمام گوشے جنھیں پست مقصدی نے اجاڑ دیا ہے نئی امنگوں، اور نئے ولولوں، نئی کوششوں اور نئی امیدوں، غرض ایک نئی زندگی کی بہار سے لہلہانے لگیں گے۔

اور اگر آپ اپنی قومی زندگی کی موجودہ پستی پر مطمئن ہیں تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آپ کے ثانوی مدرسے ہی کیا آپ کا سارا تعلیمی نظام بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں ذرا تبدیلی نہ کیجئے۔ وہ معاشرت میں اندھی تقلید، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں محکومیت پسندی کے پیدا کرنے، علم میں ذوق تحقیق سے اور فنوں میں ذوق تخلیق سے نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے اور کمزور جسم، بے نور دماغ، اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب کارخانے ہیں۔

لیکن باوجود اپنے عام تمدنی اطمینان کے شاید آپ پھر بھی ان مدرسوں کی نوعیت بدلنے پر مجبور ہوں، اس لئے کہ وہ اب اپنی اصلی اور بنیادی غایت کو پورا نہیں کرتے یعنی روزی نہیں دلا سکتے۔ وہ روزی کا سامان کرتے تھے سرکاری نوکریاں دلا کر، اب اس چراگاہ میں اتنا بڑا گلہ پہنچ چکا ہے کہ یہ اوروں کے لئے تنگ ہے۔ چنانچہ ان مدرسوں کے حامی بھی پریشان ہیں

کہ کیا کریں ۔ آئے دن نئی نئی تجویزیں بنائی جاتی ہیں ۔ ایک منزل تعلیم میں مدت کم کی جاتی ہے دوسری میں بڑھائی جاتی ہے، عام ذہنی تعلیم و تربیت پر تنقید اور طعن کا تان ٹوٹنے میں نہیں آتا اور جلد سے جلد تعلیمی نظام میں کسی صنعت یا حرفت یا پیشہ کی تعلیم داخل کرنے کا مطالبہ عام ہوتا جاتا ہے ۔ میرا گمان ہے کہ یہ سب نئی تجویزیں اسی نصب العین کی خادم ہیں ۔ جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں ۔ اب محرری کر کے روٹی نہیں ملتی تو کچھ اور سکھا دینا چاہیے کہ پیٹ پالنے کی صورت نکلے ۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ یہ ہنر اور دستکاری کو مدرسوں میں داخل کرنے کی تجویزیں سب کو روزی دلانے کا کام جس قدر آسان سمجھتی ہیں وہ اتنا آسان ہے نہیں ۔ وہ مدرسوں میں تھوڑا سا ایر پھیر کرنے سے حل نہ ہوگا ۔ جن ملکوں میں صنعتی تعلیم کے ادارے ہر سیکھنے والے کو دولت آفرینی کے بے شمار ڈھنگ سکھانے کو موجود ہیں وہاں بھی بیکاری سے نجات نہیں ۔ کام سیکھے نوجوان کام کرنے کو تیار مارے مارے پھرتے ہیں اور کوئی کام نہیں ملتا ۔ اس لئے یہ سمجھ کر اپنے کو دھوکا نہ دیجیے کہ آپ اپنے مدرسوں میں جزوی تبدیلیوں سے اس مسئلہ کو حل فرمالیں گے ۔ یہ اس سے بہت زیادہ وسیع مسئلہ ہے یہ ساری قوم کی معاشی تنظیم کا مسئلہ ہے، قوائے دولت آفریں کے بہتر نظم، اور تقسیم دولت کے بہتر طریقوں کا مسئلہ ہے، یہ قومی سرمایہ اور قومی محنت کے صحیح تعاون کا مسئلہ ہے، شرح پیدائش اور شرح اموات کو قابو میں لاکر آبادی کو ایک خاص درجہ پر قائم رکھنے کا مسئلہ ہے، یہ مدرسوں میں خیاطی اور نجاری کے جاری کر دینے یا اُن کے اجرا پر ایک رپورٹ شائع کر دینے سے حل نہیں ہوگا ۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ روٹی کمانا زندگی کے اہم ترین کاموں میں سے ہے ۔ لیکن اس فرض کے پورا کرنے میں آدمی پر اپنی شخصیت، انفرادیت اور آدمیت کا احترام بھی لازم ہے، جانور بھی اپنا پیٹ پالنے کے لئے اپنی فطری جبلت اور قدرتی صلاحیت کو ترک نہیں کرتے، غریب انسان کیوں اپنے پیٹ کی خاطر اپنی فطرت اور قدرتی صلاحیتوں کی بھینٹ چڑھانے پر مجبور ہو ۔ عام انسانی معیشت کے لئے بھی یہی اچھا ہے کہ آدمی وہی پیشہ اختیار کرے جس کی خاص صلاحیتیں اس میں ودیعت کی گئی ہیں ۔ حسن اتفاق کہ جو آدمیت اور معیشت دونوں کا تقاضا ہے صحیح تعلیم کی بھی وہی ایک راہ ہے ۔ اس لئے کہ تعلیم کا ایک ہی صحیح طریقہ

تو ہے کہ جب ثانوی منزل میں طالب علم کے ذہن میں تفریق پیدا ہو تو اس کی ذہنی نشو و نما ان اشیاءِ تمدنی کے ذریعہ کی جائے جو اس کی مخصوص ذہنی ساخت اور فطری صلاحیتوں کے مطابق اور مناسب ہوں۔ تمدنی اشیاء ذہن معروض ہوتی ہیں، ان کے اندر اپنے وجود میں لانے والے یا لانے والوں کی ذہنی قوتیں محفوظ ہوتی ہیں، جب کوئی دوسرا دماغ ان کو سمجھتا، اپناتا، برتتا ہے تو یہ قوتیں اس دماغ کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ اہل علم کے اس مجمع پر یہ بات مخفی نہ ہوگی، کہ ان ذہنی قوتوں کے ذریعہ جو اشیاءِ تمدن میں مضمر ہوتی ہیں دوسرے ذہنوں کو غذا پہنچانا اور اس سے ان کو تربیت دینا ہی اصل تعلیم ہے۔ تعلیم نام ہی ذہن معروض کے یوں ذہن موضوع بننے کا ہے۔

اگر یہ نکتہ ان لوگوں کے پیش نظر ہو جو ہمارے نظام تعلیم، خصوصاً ثانوی تعلیم کے نظام کو بدلنے کے منصوبوں پر طبع آزمائی فرماتے ہیں تو غالباً وہ محض چند انتظامی تبدیلیوں سے، یا 'مضامین' کے اضافہ یا کمی سے، یا مدت تعلیم کی کاٹ چھانٹ سے، یا یونیورسٹی پر نوجوانوں کی یورش کو روکنے کے لئے ایک خاص عمر تک عام تعلیم دینے کے بعد صنعتی، تجارتی، زراعتی مدرسوں میں اس ریلے کو موڑنے کی تجویزوں سے ہماری تعلیمی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کریں اور زیادہ بنیادی غور و فکر کے بعد اصلاح کی شاید زیادہ بنیادی تدابیر سوچیں۔

مثلاً ہماری ابتدائی تعلیم کے سراسر صلاحیت کش نظام کو بدلے بغیر وہ ثانوی تعلیم کو درست کر سکنے کی موہوم امیدیں نہ باندھیں۔ شاید وہ سمجھیں کہ بچپن میں جب کہ فطرت بچے کو اپنے ماحول سے تجربہ کرنے پر مجبور کرتی ہے، جب گرد و پیش کی چیزوں کو برت کر، بنا کر، بگاڑ کر، توڑ کر جوڑ کر سمجھنے اور ان سے تعلقات قائم کرنے پر طبیعت اسے دم بدم اکساتی ہے، جب وہ اپنے حواس کی مشق چاہتا ہے، جب وہ اپنے اعضاء و جوارح کے استعمال سے ان کی قوت کا احساس اپنے اندر قوی کرنا چاہتا ہے، یعنی جس عمر میں معمولی بچوں کی بہت بڑی اکثریت کا رجحان طبع عمل اور تجربہ کی طرف ہوتا ہے اس عمر میں ہم ان کو صرف کتابیں دے کر تنگ و تاریک مکانوں میں قیدیوں کی طرح نہ بٹھائیں اور ان کو ان کے فطری ماحول سے جدا کرنے کی وہ مؤثر تدبیریں نہ کریں جو ہم اپنے ابتدائی مدارس میں کرتے ہیں۔ شاید ہم اصلاح اور تبدیلی کی

ایسی تدبیریں نکال سکیں جن سے ہمارے ان ابتدائی مدرسوں میں سہمے ہوئے، پژمردہ چہروں کی جگہ خوش خرم، ہنستے بولتے بچّے دکھائی دیں اور ہمارے مدرسوں کی قبرستانوں جیسی خاموشی بس پہاڑوں کی رٹائی اور سزا پاکر چیخنے کی آوازوں ہی سے نہ ٹوٹے بلکہ ان کی فضا بچّوں کی ہنسی، ان کے کھیل کے شور اور ان کے کام کی ہماہمی سے معمور ہو۔ تاکہ تقاضائے فطرت کے خلاف محض کتابی تعلیم پاکر ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیتیں پوشیدہ یا پژمردہ نہ ہو جائیں اور ہم ثانوی تعلیم کی منزل میں پہنچنے کے وقت کم وبیش معلوم کرسکیں کہ بچّے کی طبیعت کا عام رجحان کیا ہے۔ شاید خالی قیاسی تک بندیوں کو چھوڑ کر ہم اپنے تعلیمی ماہروں سے یہ معلوم کرائیں کہ بچّے کے شعور میں صلاحیتوں کی تفریق کس عمر میں شروع ہوتی ہے اور اس کی اشکال نفسی کے کون کون سے عام سانچے ہیں تاکہ ابتدائی تعلیم کے ختم پر والدین اور سرپرستوں ہی کو نہیں حکومت کو بھی یہ مشورہ دیا جاسکے کہ ان بچّوں میں کس قسم کی خاص صلاحیتوں اور کن خاص رجحانات کا پتہ چلتا ہے اور ان کو کس قسم کی ثانوی تعلیم دینی چاہئے۔

اور پھر شاید ان متفرق صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر ہم کئی قسم کے ثانوی مدارس ساتھ ساتھ قائم کریں جن میں سے کوئی لسانی وتاریخی رجحان طبع کی رعایت سے اسی کے مطابق تمدنی اشیاء سے اپنے طلبہ کی ذہنی تربیت کا انتظام کرے۔ کوئی حکمیاتی صنعتی صلاحیتوں کو سامنے رکھے، کوئی جمالیاتی تحقیقی میلانات کو لیکن چونکہ سب صورتوں میں پورے یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوجانا ضروری نہیں کہ طبیعت کا مستقل رجحان کیا ہے۔ اس لئے ان ثانوی مدارس میں بھی شاید اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ مدرسہ کا مخصوص نصاب طالب علم کا سارا وقت نہ لے لے بلکہ اس کے لئے دوسرے مشاغل کا بھی موقع ہو تاکہ دوسری صلاحیتیں بھی اگر ہوں تو بے استعمالی سے پژمردہ نہ ہوجائیں اور اگر کسی صلاحیت کے اندازہ میں غلطی ہوئی ہے تو اس کی تصحیح ہوسکے۔

اگر یہ انتظام ہوجائے تو شاید ہم عام تعلیم اور پیشہ کی تعلیم کے تضاد پر بے سود بحثوں اور روٹی کمانے اور آدمی بنانے کی جدا جدا تعلیموں کے امکان پر لاحاصل طبع آزمائیوں سے بچ جائیں۔ اس لئے کہ جب ثانوی تعلیم کا یہ متنوع نظام اپنے طلبہ کی فطری صلاحیتوں کی رعایت شروع ہی سے رکھے گا تو گویا یہ ثانوی مدرسے دراصل عام طور پر تو اس پیشے ہی کے لئے طلبہ کو

تیار کریں گے جن کے وہ اہل ہیں۔ تمدن کے اس مخصوص شعبے کی مدد سے جس کے ساتھ اسے طبعی مناسبت ہے ہر طالب علم کی ذہنی نشو و نما کا سامان ہوگا اور یوں تربیت پا کر یہ تمدن کے دوسرے شعبوں سے بھی متمتع ہو سکے گا۔ شاید ان تعلیم کا انتظام کرنے والوں سے، جو اس وقت میرے تخیل کے سامنے ہیں، یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ ثانوی تعلیم تمدن کے کسی مخصوص جز کی مدد سے ہی طلبہ کو کل تمدن کا محرم بنا سکتی ہے اور پہلے پورا متمدن انسان بنا کر مخصوص صلاحیتوں کی تہذیب نہیں ہوتی بلکہ مخصوص صلاحیتوں کی تربیت کے ذریعہ ہی پورا متمدن انسان بنتا ہے۔

ذہنی تربیت کے لئے تو کہیں ادب و لسانیات سے، کہیں فنون لطیفہ سے، کہیں صنعت و حکمیات سے مختلف مدرسے زیادہ کام لیں گے لیکن غالباً ہماری ثانوی تعلیم کا یہ نیا نظام اپنے طلبہ کے افق اقدار کو معین کرنے اور وسعت دینے کے لئے، انھیں اپنے نصب العین سے آگاہ کرنے انھیں اپنے ماضی کا رمز شناس بنانے، اور ان میں مستقبل کے امانت دار ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لئے تمام مدارس میں اپنے دین، اپنی تاریخ اور اپنی زبان کی تعلیم کا خاص انتظام رکھے گا اور انھیں خالی چندہ وصول کرنے یا اعتراضات ٹال سکنے کا وسیلہ نہ بنائے گا۔ وہ ان چیزوں کی تعلیم کے بہتر سے بہتر اسلوب ڈھونڈھے گا۔ ان پر بہتر سے بہتر تعلیمی سامان فراہم کرے گا، اور ان کی تعلیم کے لئے بہتر سے بہتر استاد تیار کرنے کا خاص اہتمام کرے گا۔ اس لئے کہ ثانوی تعلیم کی منزل میں نوجوان اپنے جذبات کی تہذیب کے لئے شخصی مثال کا بہت ہی زیادہ محتاج ہوتا ہے اور اخلاقی و مذہبی اقدار کی پہچان اور ان سے لگاؤ کے لئے تو اکثر تاریخی اور اپنے ماحول کی شخصیتوں کا اثر ہی فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔

شاید یہ نیا نظام اپنے استادوں کا اس سے زیادہ احترام کرے گا جتنا کہ ہم آج کل کرتے ہیں۔ وہ شاید بہت دیکھ بھال کے بعد کسی کو استاد بننے دے گا لیکن جس کو استاد بنائے گا اسے قومی زندگی میں وہ مرتبہ بلند بھی دے گا جس کا کہ ہر اچھا استاد مستحق ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کو، کہ سب سے گراں بہا متاع ملی ہیں، ان استادوں کے سپرد کرے گا تو ان کی امانت پر بھروسا بھی کرے گا۔ پھر ان استادوں کے پاس قوم کے دل کی کنجی ہوگی، ان کی شخصیت کے جادو سے اجاڑ دلوں سے حیات تازہ کے چشمے ابلیں گے اور متحیر و متلاشی نوجوانوں کی شب تاریک جستجو میں ستارہ

راہ نما تاروں سے جگمگا اُٹھے گی۔

شاید اس نئے نظام میں، جس کا ذکر اس وقت ایک خواب کے بیان سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا مگر جس کو سچ کر دکھانا بہت کچھ آپ کے میرے ہاتھ میں ہے، غالباً تعلیم کا خالص کتابی و نظری طریقہ بھی اس طرح نہ چھایا رہے گا جیسا کہ آج ہے اور مدرسوں میں ہمارے بچے اور نوجوان صرف سُن سُن کر اور مقررہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے دماغوں کو غیر منہضمہ معلومات اور واقفیت سے نہ اٹا کریں گے بلکہ کارگاہوں اور معملوں اور کتب خانوں میں اپنی جستجو، اپنے شوق اور اپنی محنت سے، بے شک شفیق اور لائق استادوں کی نگرانی میں مگر اپنی آزادی اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ، سچے اکتشاف کی لذت سے آشنا ہو سکیں گے۔

لیکن ذہنی تحصیل کے اس انفرادی طریقہ کے باوجود شاید یہ مدرسے جماعتی احساس پیدا کرنے اور جماعتی تعاون کی عادت ڈالنے کے مواقع اور وسائل سے اس طرح تہی دامن نہ ہوں گے جس طرح ہمارے موجودہ مدارس ہیں اور شاید سیرت کی تربیت کو معلومات کے حصول سے پیچھے رکھنے پر یہ مدرسے کسی حال میں راضی نہ ہوں گے۔ شاید جماعتی احساس اور جماعت کی خدمت کا ولولہ ان مدرسوں میں خالی زبانی تلقین کے ذریعہ پیدا نہ کیا جائے گا بلکہ مدرسوں کی زندگی خود باہر کی جماعتی زندگی کا نمونہ ہوگی اور اس کے انتظام و انصرام کا بوجھ زیادہ تر خود طلبہ پر ہوگا۔ ہمارے یہ نئے مدرسے نوجوانوں کی خود مختار آبادیاں ہوں گے جن میں نئی نسل اپنی جماعتی زندگی کی تشکیل کا عملی تجربہ حاصل کرے گی اور ایک آزاد قوم کے نوجوان آزادی کو قائم رکھنے اور برتنے اور ترقی دینے کے لئے تیار ہوں گے۔

ہمارے یہ نئے مدرسے شاید باہر کی دنیا سے ایسے بے خبر نہ ہوں گے جیسے کہ آج ہیں اور ثانوی تعلیم کے اداروں میں استادوں کو یہ فکر نہ ہوگی کہ اپنے طلبہ کو مدرسے کے کانچ گھر میں چھوئی موئی کی طرح دنیا سے الگ تھلگ رکھیں بلکہ یہ فکر رہا کرے گی کہ ان نوجوانوں کے لئے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں کہاں کہاں خدمت کے مواقع پیدا کریں اور کس کس طرح انھیں حقیقی زندگی سے دوچار کرنے کی سبیل نکالیں۔ اس لئے کہ ان مدرسوں کے استاد اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ سمجھیں گے کہ ایک طرف طلبہ کی فطری خصوصیات کا پاس رکھ کر ان

کے ذہن کی تربیت کریں اور دوسری طرف اس تربیت یافتہ ذہن کو قومی نصب العین کا خادم بنائیں اور اس لئے تیار کریں کہ یہ اپنی جماعت کو انسانیت کی فلاح یعنی مرضیٔ الٰہی کے پورا کرنے کا آلہ بنائیں۔

ہمارے یہ مدرسے بے شک اسلامی مدرسے ہوں گے اور اسلامی نصب العین ہی ان کے سامنے ہوگا مگر اس نصب العین کی کوئی تنگ اور غلط تعبیر ان مدرسوں کو فرقہ پروری اور جماعتی خود غرضی کا مرکز نہ بنانے پائے گی اور بے جا تعصب ان کی نظر سے اس نکتہ کو نہ چھپا سکے گا کہ اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں، اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مامور ہیں۔ اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقوے کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل و رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے۔ چنانچہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے ارد گرد ان کے اپنے گھر میں غلامی رہے گی اور افلاس، فلاکت رہے گی اور جہل، بیماریاں رہیں گی اور بدکرداریاں، پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں یہ چین کی نیند نہ سوئیں گے اور اپنے بس بھر ان کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے۔ یہ روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے، پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین کی اور اپنے وطن کی خدمت ہوگی۔ جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی۔ یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی، کہ کبھی دنیا اسے جنت نشان کہتی تھی پر جو آج بے شمار انسانوں کے لئے دوزخ سے کم نہیں، سیوا کریں گے اور اسے ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید، غلام باسیوں کے سامنے، انھیں اپنے رحمٰن و رحیم رزّاق و کریم، حی و قیوم، خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کوتاہیوں نے، بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچا دیا

ہے کہ ان کا وجود محدود نگاہوں کو اس کی شان ربوبیت پر ایک دھبہ سا معلوم ہوتا ہو۔
اور یہی نہیں یہ اپنی اس بے غرض خدمت سے خود اپنے دیس والوں کو تنگ نظرِ وطنیت کے عذاب سے بچائیں گے اور اپنے وطن کو دنیا اور انسانیت کا خادم بنائیں گے ہمارا وطن اپنی آبادی کے لئے دوسروں کی بربادی، اپنی ترقی کے لئے دوسروں کا تنزل، اپنی قوت کے لئے دوسروں کی کمزوری اور اپنی آزادی کے لئے دوسروں کی غلامی کے سامان کبھی نہ کرے گا۔ بلکہ جس طرح ہمارا ہر فرد اس نئے نظام تعلیم کی مدد سے اپنی تمام مخصوص صلاحیتوں کو نشو ونما دے کر اپنی تربیت یافتہ شخصیت کو جماعتی خدمت کے لئے وقف کرے گا اسی طرح ہمارا وطن اپنی تمام مخصوص قوتوں کو ترقی دے کر دنیا اور انسانیت کی خدمت گزاری کا شرف حاصل کرے گا۔

آپ کہیں گے کہ یہ شخص ہمیں مستقبل کے یہ فرضی افسانے کیوں سنا رہا ہے۔ معاف کیجئے اس لئے سناتا ہوں کہ اسی طرف امید کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور ہر جگہ 'شاید' اس لئے لگاتا جاتا ہوں کہ اپنے آس پاس ان امیدوں کے بر آنے کے خلاف بھی قرائن پاتا ہوں لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خوددار آزاد جماعت کی طرح زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پون سو سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا، پچھلی مساعی کے تہہ میں جو نصب العین کارفرما تھا اس پر نظرثانی کرنی ہوگی اور اگر اس سے اعلیٰ تر نصب العین ان کے ہاتھ آگیا، جیسا کہ میرے عقیدے میں ضرور آئے گا، تو پھر اس نصب العین کے حصول کے لئے منجملہ اور چیزوں کے اپنا ایک خاص نظام تعلیم بھی مرتب کرنا ہوگا جو کسی دوسرے ناقص نظام کی ناقص تر نقل نہ ہوگا بلکہ ہماری مخصوص تخلیق ہوگا، ہمیں ثانوی تعلیم کے نظام سے پہلے عام ابتدائی تعلیم کا نظام بنانا اور جاری کرنا ہوگا، ایک خاص عمر پر بچوں کے رجحانات کی پڑتال کا انتظام کرنا ہوگا، پھر ثانوی تعلیم کے لئے ایک ساتھ مختلف قسم کے، غالباً چار پانچ قسم کے مدارس قائم کرنے ہوں گے، ان مدرسوں میں علاوہ اس شعبۂ تمدن کے جو ہر مدرسہ کا مخصوص ذریعۂ تعلیم ہوگا اپنے دین اپنی تاریخ اور اپنی زبان کی تعلیم کا نصاب معین کرنے اور اس کے استادوں کی تیاری میں خاص توجہ سے کام لینا ہوگا، ذہنی نشو ونما

خطبۂ صدارت

شعبۂ تعلیم ثانوی

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

شیخ الجامعہ

تعارف

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۱۹۳۷ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا وہ مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر شعبہ کا ایک علیحدہ صدر اور سکرٹری تھا۔

منجملہ ان شعبوں کے ایک شعبہ تعلیم ثانوی تھا جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ دہلی اور سکرٹری خواجہ غلام السیّدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج (مسلم یونیورسٹی) تھے۔

اس شعبہ کا اجلاس ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو بوقت ۱۰ بجے صبح اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا، اس اجلاس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جو خطبہ پڑھا وہ حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ صدارت شعبۂ تعلیم ثانوی

از

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

حضرات! اس تاریخی تعلیمی انجمن کے محترم کارکنوں کی خدمت میں اس کی پنجاہ سالہ جوبلی پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اس ذرہ نوازی پر جو مجھے اس شعبہ کی صدارت کے لئے بلاکر فرمائی گئی ہے دلی شکریہ۔ اپنی بے بضاعتی کے علم کے باوجود اپنی طلبی پر اس لئے خوش ہوں کہ شاید اس سے اس اہم تعلیمی تجربہ میں جو میرے ساتھی جامعہ ملیہ میں کر رہے ہیں ان کی اور میری ہمت افزائی مقصود ہو، اور شاید اس میں یہ احساس بھی مضمر ہے کہ مسلمانان ہند کے تعلیمی نظام میں اس کانفرنس کے نزدیک صرف ایک خاص قسم کی تعلیم گاہوں کے لئے ہی جگہ نہیں بلکہ اس کی تکمیل ابھی بہت سے دوسرے تعلیمی تجربوں اور کوششوں کی محتاج ہے۔

اس کانفرنس کو اپنا تعلیمی کام شروع کئے آج ۵۰ سال ہوئے، لیکن محض ۵۰ سال کا گذر جانا کوئی خوشی کی بات نہیں۔ وقت تو جوں توں بیتتا ہی ہے، زمانہ شاد و ناشاد کٹتا ہی ہے۔ اس کے گذر جانے پر نہ خوشی کا موقع ہے نہ رنج کا۔ ہاں خوشی اس پر ہو سکتی ہے کہ جو کام لیکر اُٹھے تھے وہ اچھا تھا اور جہاں تک بن پڑا کیا بھی۔ رنج اس پر ہو سکتا ہے کہ جو پیش نظر تھا اس میں خامیاں تھیں یا اس کے پورا کرنے میں کوتاہیاں ہوئیں۔ اور میں

سمجھتا ہوں کہ اگر ہم دیانت سے اپنے ماضی کا جائزہ لیں تو شاید خوشی اور افسوس دونوں ہی کے مواقع ملیں گے۔ مگر یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ اس وقت کو جب کہ ہم اپنے کام پر ایک مدت کے گذر جانے کی وجہ سے خاص طور پر متوجہ ہو گئے ہیں' یوں ہنس کر یا رو کر گذار دیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے کام کا جائزہ لیں' اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں سے سبق حاصل کریں اور نصف صدی کے تجربہ کی روشنی میں آگے چلنے کی راہ ڈھونڈیں۔ یعنی اپنے پچاس سال کے تعلیمی کام پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں۔

کسی تعلیمی کوشش پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کی صحیح ماہیت پیش نظر ہو۔ آپ کی کانفرنس کا نام اور اُس کے کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ آپ صحیح طور پر تعلیم کو ایک جماعتی کام سمجھتے ہیں۔ فرد کی تمام قوتوں کی پوری پوری نشو و نما جماعت ہی میں ممکن ہے خصوصاً ذہنی زندگی کہ حیات انسانی کی خصوصیت ہے۔ بلا جماعت کے ممکن ہی نہیں۔ ہر جماعت اپنے وجود کو قائم رکھنے' اپنے ماضی کی تحصیلات کو محفوظ کرنے' اور ان میں حسب ضرورت تبدیلی اور اضافہ کرنے کا اہتمام اپنی تعلیمی کوششوں ہی سے کرتی ہے۔ اپنی آنے والی نسلوں کی ذہنی نشو و نما کا کام اپنے موجودہ تمدن کی چیزوں سے لیتی ہے' نوخیز دماغ ان چیزوں سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کی خفتہ ذہنی قوتیں بیدار ہوتی ہیں اور تربیت پاتی ہیں۔ اور یوں تربیت پاکر اس متاع تمدنی میں اضافہ کرنے اور اسے بدلنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کرتی ہیں۔ تعلیم نام ہی اس کا ہے کہ متعلم کے کل قوائے جسمانی و ذہنی کی تربیت کرکے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اسے تمدنی زندگی کے کل شعبوں کا محرم بنا کر اس میں اپنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کے لئے تیار کیا جائے۔ لہذا تعلیمی نظام کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے کہ جماعت کے سامنے کوئی تمدنی نصب العین موجود ہو۔

جماعت کے تمدنی مطمح نظر اور اس کے تعلیمی نظام میں جب یہ چولی دامن کا ساتھ ہے تو پھر تعلیم پر تنقید کی دو راہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ دیکھنا کہ آیا تعلیم اس تمدنی مطمح نظر کے مطابق ہے یا نہیں اور اس کی صحیح خدمت کرکے اپنا مخصوص وظیفہ انجام دے رہی ہے یا نہیں۔ یا اگر وہ خدمت گزاری کا یہ فرض انجام دے رہی ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ خود وہ مطمح نظر درست ہے یا نہیں۔

عارضی طور پر بعض وقتی حالات نے جماعت کا نصب العین بنا دیا ہے، یا یہی اس کا مستقل منتہائے نظر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ پہلی راہ گویا وسائل پر تنقید ہے اور دوسری مقاصد پر۔

میں تنقید کی یہ صورت اس وجہ سے اور بھی اختیار کرنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کی تین رسمی تقسیموں یعنی ابتدائی، ثانوی، اور اعلیٰ میں ثانوی تعلیم کا تعلق تمدنی زندگی اور اس کے مقاصد سے بہت ہی گہرا ہے۔ اس لئے کہ ابتدائی تعلیم تو بچہ کو اس عمر میں دی جاتی ہے جبکہ اس کا شعور مقابلۃً بہت محدود ہوتا ہے، اور اس کی ترکیب نفسی میں وحدت ہوتی ہے۔ وہ تمدن کی تحلیل مختلف اجزا میں نہیں کرسکتا نہ اس پر تنقیدی نظر ڈال سکتا ہے۔ وہ تو زیادہ تر اپنے ماحول کی زندگی سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے اس منزل میں معلم کا کام بہت کچھ یہ ہے کہ بچہ کے لئے ایسا مفید تعلیمی ماحول مہیا کر دے جس میں اسکی جسمانی اور ذہنی قوتیں مجموعی طور پر ابھر سکیں اس راہ میں ایک حد تک معلم بچے کو انگلی پکڑ کر چلاتا ہے اور اگرچہ اچھے استاد کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچہ جلد بغیر سہارے کے خود چلنے لگے، پھر بھی رستہ بتانے کی ذمہ داری بہت کچھ اسی پر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بچہ عمر کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جب وہ ہر چیز کو آپ جانچنا اور پرکھنا چاہتا ہے، جہاں ایک طرف اس میں شعوری تنقید کا مادہ ابھرتا ہے اور دوسری طرف اس کے قوائے ذہنی میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ وہ تمدنی شعبوں کے تنوع کو محسوس کرنے لگتا ہے ان کی کثرت کو دیکھ کر پریشان بھی ہوتا ہے اور ان میں وحدت کی تلاش بھی کرتا ہے۔ اس منزل میں خصوصیت سے معلم کا کام بہت نازک ہے۔ اب اسے نوجوان متعلم کے سامنے الگ الگ ہر شعبۂ زندگی، مذہب، معاشرت، سیاست وغیرہ کی تفسیر کرنی ہے، ان سب کا باہمی ربط سمجھانا ہے، اسے ان میں حصہ لینے کے لئے تیار کرنا ہے مگر اس طرح نہیں کہ نوجوان کی آزادی رائے کو دبا کر اسے تقلید پر مجبور کرے بلکہ اس طرح کہ اسے تنقید کا پورا موقع دے، اس کے سارے شک شبہے جہاں تک ہو سکے دور کرے اور جہاں یہ نہ ہو سکے اپنی راہ پر چلنے دے بشرطیکہ وہ دوسروں کی راہ میں حائل نہ ہو۔

اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی باری آتی ہے جس میں نوجوان متعلم عام ذہنی تربیت کی منزل سے گذر کر خاص علوم و فنون میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ اگر ثانوی تعلیم صحیح اور مکمل ہو تو اعلیٰ تعلیم

کا مسئلہ بہت سہل ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اسے ضرور معلّم کی مدد درکار ہوتی ہے، مگر اب پیش قدمی اس کی طرف سے ہوتی ہے اور ذمہ داری بھی اس کی اپنی ہوتی ہے۔

مندرجۂ بالا بحث سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ثانوی تعلیم کی منزل اس لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں تمدن کی تفسیر اور ترجمانی کا کام جو معلّم کو ہر منزل میں کرنا پڑتا ہے خاص طور پر مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں معلّم کا کام یہ ہے کہ تمدنی زندگی کو مختلف اجزا میں تحلیل کر سکے۔ نوجوان کی تنقیدی قوت کو بھی اُبھارے مگر صحیح راہ سے بھٹکنے بھی نہ دے، اس کی انفرادیت کا احترام بھی کرے اور اسے جماعتی زندگی سے ربط دینے کی کوشش بھی۔ غرض یہ کہ یوں تو تعلیم کی ہر منزل میں ایک تمدنی نصب العین کا رکھنا ضروری ہے لیکن ثانوی منزل میں معلّم کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اس نصب العین کا واضح تصور اور اس سے دلی لگاؤ رکھتا ہو اور اس کی تفسیر و ترجمانی بخوبی کر سکے۔

نصب العین کے معین ہونے کے بعد ہی نصاب اور طریقۂ تعلیم یعنی ان وسائل و ذرائع کا تعین ممکن ہوتا ہے جن سے وہ نصب العین حاصل کیا جا سکے۔ چنانچہ میں اس وقت مسلمانوں کی موجودہ ثانوی تعلیم کے نصب العین، نصاب اور طریقہ ہی پر اجمالی تبصرہ کرنا اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تینوں میں کس حد تک اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس تبصرہ کو مجبوراً مسلمانوں کی جدید تعلیمی کوششوں تک محدود رکھوں گا۔ قدیم نظام تعلیم پر بھی اس نقطۂ نظر سے تنقید ایک ضروری کام ہے، لیکن اس کا یہ موقع نہیں۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی جدید تعلیم، جو سرکاری محکمۂ تعلیم کی پابند اور مقلد ہے کوئی نصب العین نہیں رکھتی۔ مگر میرے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ نصب العین کے وجود کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ معین الفاظ میں قلم بند ہو، تعلیم دینے والوں، تعلیم کا انتظام کرنے والوں، تعلیم دلانے والوں کے ذہن میں اس کا ہونا اور ان کے عمل سے اس کا اظہار کافی ہے۔

ہاں، تو یہ نصب العین کیا تھا؟ یہ نصب العین یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے افراد کی جتنی تعداد اپنا پیٹ پال لے، سرکاری نوکریاں پا کر آرام چین اور ہاں تھوڑی سی حکومت کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے کے قابل ہو جائے اچھا ہے۔ یہ چند افراد

اپنی خوش حالی کا معیار جس قدر بڑھا لیں اتنی ہی قوم خوش حال سمجھی جائے۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں وہ ہر طرح کم کی جائیں، مستقبل کے مشتبہ منصوبوں سے حال کی یقینی بہرہ مندیوں میں ہرج نہ ہو، اور قومی آخرت کا تصور انفرادی دنیا کے عیش میں خلل نہ ڈالنے پائے، معاشرت بدلی جائے، اپنی پرانی معاشرت بری ہے، اور بری اس لیے ہے کہ ایک با اقبال صاحب اقتدار قوم کی معاشرت سے مختلف ہے۔ سیاست سے بے تعلقی رکھی جائے اس لیے کہ انفرادی ترقی و ترفع کے لیے اپنی جماعت کے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ بہت واضح نہ تھی۔ حکومت کی جو شکل بھی ہو ہو، بس وہ امن قائم رکھ سکے۔ محکوموں کے معاملات باہمی میں انصاف کر سکے، نوکریاں دے، چند افراد کو مراتب بلند تک پہنچائے کہ اس کا کام نکلے اور ہمارے عزت بڑھے۔ مذہب کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا، چھوٹتا تو کیسے، ضرور قائم رکھا جائے، مگر اس طرح کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے، معاملات پر، کہ اہل دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو زیادہ نہ ابھارا جائے، چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ، اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے، البتہ عقائد و عبادات پر زبانی زور رہے اور عملاً رخصت، اور ہاں، احساس مذہبیت کے باب میں خود فریبی کے لیے مذہب کے ان حصوں پر جو ماورا عقل ہیں عقلی بحثیں اور فلسفہ و حکمت سے تطابق کی کوششیں بھی ہوتی رہیں تو مضائقہ نہیں۔

اس نصب العین کے حصول کے لیے جو نظام تعلیم کار آمد ہو سکتا تھا وہ وجود میں آ گیا، بہت کچھ دوسروں کی مدد سے، کچھ کچھ اپنی کوشش سے۔ اس نظام تعلیم کے پیش نظر ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا تھا کہ نوجوان لکھنا پڑھنا سیکھ کر سرکاری ملازمت حاصل کریں، اپنا پیٹ پال لیں، معاشرت میں مغربی نمونوں کی بھلی بری نقل اتار سکیں، مذہب کے سرے سے منکر تو نہ ہوں مگر اس کی حیات بخش اور زندگی پرور قوت سے محروم رہیں تو ہرج نہیں، سیاست کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رہیں، شخصی مفاد کی خاطر قوم کا نام لینے کی ضرورت پڑی تو یہ ہنر زمانہ خود سکھا دے گا، یعنی تعلیم عبارت تھی چند جزوی ہنرمندیوں سے، اطاعت شعاری کی چند عادتوں سے، انفرادی معاشی خوش حالی کے لیے مسابقت اور مقابلہ کے رجحانات سے۔

ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لئے بنائے اور ان میں اپنی قوت اور وقت اور وسائل کا جو صرف کثیر نصف صدی سے زیادہ سے کیا ان کو دیکھئے۔ کیا انھوں نے بھی اسی نصب العین کی خدمت انجام نہیں دی۔ اکبر مرحوم نے تعلیم یافتہ، آدمی کی زندگی کا جو خلاصہ کیا ہے کہ بی، اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے، کیا وہ ہمارے ان ملی اداروں کے تعلیم یافتوں پر بھی صادق نہیں آتا؟ ہم کس معنی میں انہیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں؟ کیا اسلام میں زندگی اسی پیٹ پالنے اور مر جانے کا نام ہے؟ کیا اسلام کے پیش نظر جماعت کا یہی تصور ہے کہ وہ الگ الگ افراد کا بس ایک اتفاقی اور افادی مجموعہ ہے؟ کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں اور ہزار بار نہیں۔

مگر یہ رونا اپنے تعلیمی نظام کا نہیں اپنی قومی زندگی کا رونا ہے۔ قومی انتشار و انحطاط نے قوم کے نصب العین ہی کو اتنا پست بنا دیا تھا، پھر تعلیم اپنا دامن کیسے بچاتی لیکن اس وقت کہ ہم کچھ کچھ اس نصب العین کو غلط سمجھنے لگے ہیں اگر اس تعلیمی نظام کو ہم نے نہ بدلا تو پھر خود نصب العین کو پست رکھنے کی ذمہ داری بھی تعلیم پر آئے گی۔ شکر ہے کہ آج پھر ہمیں اپنی حقیقت کا کچھ کچھ احساس ہوتا جاتا ہے۔ ہم کچھ کچھ سمجھنے جاتے ہیں کہ قومی زندگی کا وہ انفرادی انتشاری تصور ہم نہیں اپنا سکتے جو اس دور انحطاط میں ہم پر مسلط ہو گیا تھا کہ اس سے تو وجود ملت ہی کے مٹ جانے کا خدشہ ہے۔ ہم پھر اپنی ملی ہستی کی خالص دینی اور اخلاقی اساس کو دیکھنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ ہمیں اپنی ملت کے انسانی اور عالمی فرائض کا بھی کچھ کچھ دھیان پھر آنے لگا ہے۔ اور کانوں اور دلوں تک شہداء علی الناس کے مرتبہ اور ذمہ داریوں کی یاد دلانے والی آوازیں پار جانے لگی ہیں۔ ہم دین کی خارجی رسمیت کی جگہ اس کی تخلیقی اور تنویری قوت کی طرف بھی آنکھیں اٹھانے لگے ہیں جو ساری زندگی پر حاوی ہو کر اسے بامقصد و بامعنی بناتی اور کل زندگی اور کل کائنات میں ہمیں ہماری حیثیت اور جگہ بتاتی ہے۔ اور ایک ایسی دنیا جو نسل، وطن، اور

میں انفرادی طریقہ کے ساتھ مدارس کے اندر اور باہر جماعتی خدمت کے مواقع کثرت سے فراہم کرنے ہوں گے، کتابی تدریس کی جگہ عملی اکتشاف کو دینی ہوگی اور خالی واقفیت کی جگہ صحیح ذہنی تربیت اور خالی علم کی جگہ اچھی سیرت کو مرکز توجہ بنانا ہوگا اور اپنے مدرسوں کو قومی زندگی کے ساتھ ربط دینے کی تدبیریں نکالنی ہوں گی۔

میں نے دشوار کاموں کی ایک خاصی لمبی فہرست گنوا دی لیکن یہ صرف ان کاموں کے نام ہیں ان کی تفسیر و توضیح بہت کچھ چھان بین اور تحقیق کی محتاج ہے۔ پہلے ان میں سے ہر مقصد کا واضح تعین ضروری ہے اور پھر اس کے وسائل کی تلاش۔ ان پر آپ کے بہترین دماغوں کی سالہا سال کی کوشش صرف ہوگی۔ یہ سب مشکل کام ہیں لیکن کرنے کے کام ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی قومی جماعت واقعی انہیں کرانا چاہے تو کرنے والے بھی مل سکتے ہیں۔ میری آرزو ہے کہ یہ کانفرنس اپنے آئندہ لائحۂ عمل میں ان تحقیقی کاموں کی انجام دہی کو شامل کرے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ ایسا ہو سکے گا یا نہیں۔ اگر نہ ہو سکا تو آج ہم تو اس کانفرنس کے پچاس سالہ وجود پر خوشی منا رہے ہیں، ڈر ہے کہ آئندہ پچاس سال بعد خاکم بدہن اس کا ماتم کرنے والے بھی موجود نہ ہوں گے۔ قومی تعلیم کی موجودہ بے راہ روی شاید قوم کے وجود ہی کو ختم کر دے۔ اور پھر یاد انہیں کی کی جاتی ہے جو مشکل کام اپنے سر لیتے ہیں، یا تو طوفان میں طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں یا طوفان سے پہلے اس کے مقابلہ کی تیاری۔ ہمارے پچھلے کام کرنے والوں نے بھی جو کام اٹھایا تھا وہ اس وقت کچھ بہت سہل کام نہ تھا اور باوجودیکہ ہم رفتہ رفتہ اپنے پچھلے پچاس سال کے کام سے غیر مطمئن ہوتے جاتے ہیں اور اس کا نصب العین آج ہمیں پست نظر آتا ہے لیکن جن لوگوں نے اس کام کو شروع کیا تھا ان کے زمانہ کی بے حسی کو یاد کیجیے، اور قومی زندگی کے شیرازے کے اس انتشار کا خیال کیجیے جو انکی آنکھوں نے دیکھا تھا اور انکی ان کوششوں پر بھی جو آج ہمیں زیادہ نہیں جچتیں قوم کی مخالفت اور حالات کی ناسازگاری کا اندازہ لگائیے تو پتہ چلتا ہے کہ بونوں کی ایک جماعت میں یہ لوگ دیو تھے دیو۔ ان کے کام پر تنقید مستقبل کی راہ تلاش کرنے کے لئے بے شک ضروری اور مفید ہے اور اس سے ہرگز جھجکنا نہ چاہئے مگر ان کی شخصیتوں کی عظمت، ان کے

ارادوں کی مضبوطی، ان کی نیتوں کا خلوص دشمن سے بھی خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے کاموں کی تنقید کیجئے اور بن پڑے تو ان سے بہتر کام کیجئے مگر ان کی ہمت اور عزم اور بے غرض خدمت کی یاد پر احسان مندی کے دو پھول ضرور چڑھاتے جائیے۔

آوازۂ خلیل ز بنیاد کعبہ نیست
مشہور گشت زانکہ در آتش نکو نشست

کاش آج کے بدلے ہوئے حالات میں ہم بھی اسی عزم و ہمت کا ثبوت دے سکیں اور اپنی قومی زندگی کے تحفظ و ترقی کے لئے ایک نئے نظام تعلیم کی داغ بیل ڈالنے کا کٹھن مگر ضروری کام شروع کردیں۔

کانفرنس گزٹ

کے متعلق

پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبجات متحدہ کا رزولیوشن

(جو کانفرنس مذکور کے اجلاس دہم منعقدہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں پاس ہوا)

"یہ کانفرنس اس امر کو بہ نظر استحسان دیکھتی ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے تعلیمی و اصلاحی اغراض نیز اپنے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنا اخبار **کانفرنس گزٹ** جاری کیا ہے جو اپنے مفید و پر مغز تعلیمی و اصلاحی مضامین کی بنا پر اہل علم کی ستائش حاصل کر چکا ہے۔

چونکہ ہر انسٹی ٹیوشن کے لئے ایک آرگن کی ضرورت مسلّم ہے، یہ کانفرنس اس اخبار کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے پبلک کو اس کی مالی و اخلاقی اعانت پر متوجہ کرتی ہے، نیز نواب بہادر سر **محمد مزمل اللہ خاں** بالقابہ کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ ممدوح نے سنہ رواں میں اس کو پانسو روپیہ عطا فرما کر اس کی بنیاد کو محکم فرمایا۔"

مولانا حاجی عبد الماجد صاحب دریابادی بی اے کا ریویو ہفتہ وار کانفرنس گزٹ پر

"(یہ) پرچہ پندرہ روزہ کی حیثیت سے نکل رہا تھا اور سچ مرحوم میں اس کا تذکرہ بھی آچکا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہفتہ وار ہو گیا ہے اور کئی نمبر اب تک اس جدید حیثیت میں نکل چکے ہیں شرافت و متانت اس کا امتیازی جوہر ہے، یہ مدح کوئی معمولی مدح نہیں۔ گنتی کے چند ہی اخبار ہیں جو اس معیار پر پورے اُتریں گے،

نہ کسی کی پگڑی اُچھالتا ہے، نہ بدزبانی نہ فحش نویسی، نہ رکاکت و ابتذال، شروع سے آخر تک شریفوں کا لکھا ہوا، شریف گھرانوں میں جانے کے قابل، عموماً تعلیم اور اصلاح معاشرت کے مسائل پر لکھا کرتا ہے۔ کاغذ، کتابت و طباعت ظاہری حیثیت سے بھی ہر طرح پسندیدہ، ایسے اخبارات کی عملاً تائید و حوصلہ افزائی کرنا خود اپنی مدد کرنا اور قوم کا بگڑا ہوا مذاق سدھارنا ہے۔"

(اخبار صدق ۱۱ اگست ۱۹۳۵ء)

ملنے کا پتہ: **صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ**